تفقہ فی الدین کی روایت کا علم بردار

تمام اہلِ وطن کو جشنِ آزادی مبارک

ماہ نامہ

مفاہیم

جلد2/ شمارہ 9

فقہ اکیڈمی کا ترجمان

اگست ۲۰۲۲ء

فقہ اکیڈمی

FiqhAcademy.com.pk
info@fiqhacademy.com.pk FiqhAcademy
FiqhAcademypk +92 330 3474223

لیتفقهوا فی الدین

ز اجتہادِ عالمانِ کم نظر
اقتدا بر رفتگاں محفوظ تر
اقبال

من یرد اللہ بہ خیرا یفقہہ فی الدین

ماہنامہ
مفاہیم
کراچی

فقہ اکیڈمی کا ترجمان | تفقہ فی الدین کی روایت کا علم بردار

سرپرستِ اعلیٰ

حضرت مولانا مفتی نذیر احمد ہاشمی صاحب

مدیر

صوفی جمیل الرحمٰن عباسی

نائب مدیر

مولانا حماد احمد ترک

مجلسِ مشاورت

- حافظ محمد موسیٰ بھٹو صاحب
- ڈاکٹر محمد رشید ارشد
- مفتی اویس پاشا قرنی
- مولانا معراج محمد
- مولانا سید اسامہ علی
- مولانا ابرار حسین
- مولانا عابد علی بھٹی

فقہ اکیڈمی

C-335، بلاک-1، گلستان جوہر، بالمقابل جامعہ کراچی، یونیورسٹی روڈ، کراچی، پاکستان۔ 3474 3662 21 92 + | 3474 3661 21 92 +

FIQHACADEMY.COM.PK FIQHACADEMY FIQHACADEMYPK +92 330 3474223

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مضامین

نعت	آپ کی نعت کیا کہوں؟	حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم	۴
اداریہ	آہ اے ارضِ وطن	مدیر	۶
درسِ قرآن	علم اور اہلِ علم کا مقام اور ذمے داریاں	مولانا محمد اقبال	۱۳
درسِ حدیث	کامیاب انسان کے اوصاف	ابنِ عباس	۱۷
مقالات	تفسیرِ قرآن کے آداب (۲)	مولانا محمد یوسف لدھیانوی شہید رحمۃ اللہ علیہ	۲۳
مقالات	بیت المقدس کا تاریخی خاکہ (۱۴)	صوفی جمیل الرحمان عباسی	۳۰
مقالات	سفرنامۂ ترکی (۷)	مولانا حماد احمد ترک	۳۶
مسلوئک	روایت ''حب الوطن من الایمان'' کی تحقیق	دارالافتاء، فقہ اکیڈمی	۴۴
ادبیات	نظم: خدا کرے کہ میری ارضِ پاک پر اترے	احمد ندیم قاسمی	۴۶
رحلات	افغان نامہ (۱)	مفتی اویس پاشا قرنی	۴۷

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم
نائب صدر، جامعہ دارالعلوم کراچی

آپ کی نعت کیا کہوں؟

آپ کی نعت کیا کہوں؟ سیدِ خلقِ کِردگار
جلوہ گرِ الست کے سب سے حسین شاہ کار

آپ کے وصف میں سدا لفظ و بیاں فگندہ سر
آپ کی نعت کے حضور، شعر ہمیشہ شرم سار

کون و مکاں کی رفعتیں آپ کے نقشِ پا کی دھول
شمس و قمر کے دائرے آپ کی راہ کا غبار

آپ ہیں قلب و روح کی سلطنتوں کے تاج ور
آپ ہیں بامِ قدس پر حسنِ ازل کے راز دار

آپ کی اتباع میں دونوں جہاں چمن چمن
زیست بھی جس سے دل نواز، گور و کفن بھی لالہ زار

آپ سے پہلے ہر طرف ظلم و ستم کا راج تھا
آپ کے دم سے کِھل اٹھی عدل کی فصلِ نو بہار

آپ کے دم سے دور کی خالقِ کائنات نے
روحِ زمیں کی تشنگی، چشمِ فلک کا انتظار

صدیوں سے جو حقیقتیں گمرہیوں میں دفن تھیں
آپ کی اک پکار سے ہو گئیں ساری آشکار

وہم و گماں کے دشت میں بھٹکے ہوئے تھے قافلے
آپ کے دم سے پا گئے علم و یقین کا قرار

جہل کا میل اتار کر، وہم کی گرد جھاڑ کر
اُمّی نے لہلہا دیے حکمتِ دیں کے سبزہ زار

ارض و سماں سے عرش تک آپ کی عظمتوں کی دھوم
پھر بھی ہمارے درد میں فرشِ زمیں پہ اشک بار

اتنے درود آپ پر جتنی خدا کی نعمتیں
اتنے سلام آپ پر جن کا نہ ہو سکے شمار

صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم

* * * * *

مدیر
ماہنامہ مفاہیم، کراچی

آہ اے ارضِ وطن

کہتے ہیں کہ وطن کی محبت انسانوں میں جوڑ اور وحدت پیدا کرتی ہے۔ بقول اقبال: ''دھرتی کے باسیوں کی مُکتی پریت میں ہے''۔ لیکن شومئ قسمت کہ اس اتفاقی چیز نے بھی ہمیں نہیں بڑھایا مگر تفرقے میں۔ ایک طرف دین و مذہب کے کچھ نام لیوا، وطن کی محبت پر شرک کا انطباق کرتے نظر آتے ہیں تو دوسری طرف وطن والے، مذہبیوں پر ملک دشمنی اور بعض دفعہ غداری تک کا الزام لگاتے نظر آتے ہیں۔ ان حرکتوں کے بعض مرتکبین تو الزام لگاتے ہی باطن کی خرابی کی وجہ سے ہیں سو اُن کا کوئی علاج نہیں، مگر خود انھی کے پاس۔ البتہ بعض مخلص لوگ بھی اس طرح کی باتوں میں ملوث نظر آتے ہیں تو اس کی وجہ تصور محبت وطن کا واضح نہ ہونا ہے۔

وطن کی محبت کے بارے میں دو انتہائی نظریات کی مثال ہمیں کلامِ اقبال ہی میں مل جاتی ہے۔ ان کا اصولی اور آخری موقف تو ''وطنیت'' میں بیان ہوا لیکن قدیم نظم ''نیا شوالہ'' میں وہ دوسری انتہا پر نظر آتے ہیں۔ باوجود یہ کہ ان کی نظم ''وطنیت'' میں بہت کھول کر اربابِ سیاست کے تصورِ وطن اور ارشادِ نبوت کے تصورِ وطن کے فرق کو بیان کیا گیا لیکن بعض مخلصین اس نظم کے اسی شعر تک محدود رہتے ہیں:

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے جو پیرہن اس کا ہے، وہ مذہب کا کفن ہے

چناں چہ مخلص اہلِ مذہب کی طرف سے بعض دفعہ بغیر تخصیص اور استثنا کے؛ یہ شعر وطن کی محبت کی نفی میں استعمال ہوتا ہے۔ تو ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ وطن کی محبت کی جائز اور ناجائز صورتوں کو واضح کرنے کے لیے کچھ کلام کیا جائے۔

ایک بات تو یہ ہے کہ وطن کی محبت ایک فطری جذبہ ہے جو انسان کے خمیر میں ہے۔ الجامع الصحیح للسنن

والمسانید کے مولف نے وطن کی محبت کے بیان میں یہ باب باندھا ہے: صُعُوبَةُ فُقْدَانِ الْوَطَنِ وَحَنِينُ الْمُهَاجِرِينَ لِمَكَّةَ "وطن چھن جانے کی مصیبت اور مہاجرین کا مکہ کے لیے رونا" اس کے بعد یہ روایت لائی گئی کہ نبی کریم ﷺ جب مکہ سے نکلے تو حزوَرہ کے مقام پر کھڑے ہو کر آپ ﷺ نے ارضِ وطنِ مکہ کو مخاطب کر کے فرمایا: «وَاللهِ إِنَّكِ لَخَيْرُ أَرْضِ اللهِ وَأَحَبُّ أَرْضِ اللهِ إِلَى اللهِ وَلَوْلَا أَنِّي أُخْرِجْتُ مِنْكِ مَا خَرَجْتُ» "اللہ کی قسم تو اللہ کی بہترین زمین ہے اور اللہ کے نزدیک محبوب ترین زمین ہے اور اگر مجھے تجھ سے نہ نکالا جاتا تو میں یہاں سے نہ نکلتا"۔ ایک روایت میں آتا ہے: «وَلَوْلَا أَنَّ قَوْمِي أَخْرَجُونِي مِنْكِ مَا سَكَنْتُ غَيْرَكِ» "اگر میری قوم مجھے یہاں سے نہ نکالتی تو میں تیرے سوا اور کہیں سکونت اختیار نہ کرتا"۔ مدینہ آمد کے بعد بھی رسول اللہ ﷺ مکہ کی یاد سے غافل نہیں ہوئے۔ حضرت اُصیل الغِفاری رضی اللہ عنہ پردے کے احکامات کے نزول سے پہلے مدینہ تشریف لائے تو سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا ان سے پوچھتی ہیں: "اصیل تم مکہ کو کیسا چھوڑ آئے؟"، وہ مکہ کا کچھ حال بیان کرتے ہیں تو آپ ان سے فرماتی ہیں: "یہاں رکو جب تک رسول اللہ ﷺ تشریف لے آئیں"۔ جب آپ ﷺ تشریف لاتے ہیں تو اصیل سے سوال فرماتے ہیں: "اصیل! تم مکہ کو کس حال میں چھوڑ کر آئے"۔ وہ کہتے ہیں: "خدا کی قسم میں اس حال میں مکہ سے جدا ہوا کہ اس کے (محلوں کے آس پاس) کی پگڈنڈیاں سرسبز ہو چکی تھیں۔ اس کی وادیاں بارشوں کے پانی سے سفید اور تربہ تر ہیں۔ اس کی اذخر گھاس خوب گھنی ہو گئی ہے اور ثُمام گھاس بھی بہت زوروں پر ہے اور درختوں گھنے اور خوب سرسبز ہو چکے ہیں"۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «حَسْبُكَ يَا أَصِيلُ لَا تُحْزِنَّا» "اے اصیل بس بھی کرو، ہمیں مزید دکھی نہ کرو"۔ (اخبار مکہ للارزقی)

ان روایات میں مذکور ملکی محبت میں مکہ کی دینی عظمت ایک بات ہے لیکن رسول اللہ ﷺ کی اس شہر سے محبت میں وطن کی محبت کا عنصر بھی یقینی طور پر موجود تھا۔ اس کا اشارہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں ملتا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ اور ان کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مدینہ میں وارد ہوئے تو کئی صحابہ کرام بیمار پڑ گئے۔ جب ابوبکر رضی اللہ عنہ کی عیادت کی گئی تو وہ کہنے لگے: "موت جوتے کے تسمے سے بھی نزدیک ہے"۔ حضرت عامر بن فہیرہ رضی اللہ عنہ کہنے

لگے: ''میں نے موت کا ذائقہ چکھنے سے پہلے ہی اس سے ملاقات کرلی''۔ حضرت بلال عتبہ وشیبہ وغیرہ پر لعنت بھیج رہے تھے کہ انھوں نے ہمیں دیس نکالا دیا۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے یہ تفصیل رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں عرض کی تو آپ نے یوں دعا فرمائی: «اَللَّهُمَّ حَبِّبْ إِلَيْنَا الْمَدِينَةَ كَحُبِّنَا مَكَّةَ أَوْ أَشَدَّ اللَّهُمَّ بَارِكْ لَنَا فِي صَاعِنَا وَفِي مُدِّنَا، وَصَحِّحْهَا لَنَا، وَانْقُلْ حُمَّاهَا إِلَى الْجُحْفَةِ »(صحیح بخاری) ''اے اللہ! ہمیں مدینہ اتنا ہی محبوب بنادے جتنا ہم مکہ سے محبت کرتے ہیں یا اس سے بھی زیادہ۔ اے اللہ! ہمارے (پیمانوں) صاع اور مُد میں برکت دے، اور اس شہر کو ہمارے لیے ساز گار بنادے اور یہاں کے بخار کو جُحفہ کی طرف منتقل کردے''۔ اس نبوی دعا میں مدینہ کی وبا کا ازالہ اور مدینہ میں برکت کی دعا کے ساتھ مدینہ کی محبت کا سوال بھی ہے اور وہ بھی مکہ کے برابر یا اس سے زیادہ، اگر مکہ کی محبت صرف دینی فضیلت کی وجہ سے ہوتی تو وہ اب بھی برقرار تھی لیکن اس کے ساتھ وطنی محبت کا عنصر بھی شامل تھا اور اسی اعتبار سے مدینہ کو محبوب بنانے کی دعا فرمائی گئی۔

ایک روایت میں نبی کریم ﷺ کی دعا کے یہ الفاظ ملتے ہیں: «اللهُمَّ اجْعَلْ بِالْمَدِينَةِ ضِعْفَيْ مَا بِمَكَّةَ مِنَ الْبَرَكَةِ »(صحیح مسلم) ''اے اللہ! مدینہ کو مکہ کی برکت کی نسبت سے دگنی برکت عطا فرما''۔ غور کیجیے یہاں بھی برکت سے مراد دینی برکت یا فضیلت نہیں ہے، اس لیے کہ احادیثِ رسول ﷺ کے مطابق امت کا اجماع ہے کہ حرمِ مکی کی نماز حرمِ مدنی کی نماز سے زیادہ افضل ہے۔ بلکہ یہاں برکت سے وہ مادی برکات مراد ہیں جن کی وجہ سے انسان کسی جگہ پر سکون محسوس کرتا ہے اور وہ زمین اس کا وطنِ مالوف بن جاتی ہے۔ ایک دعا میں یہ الفاظ ملتے ہیں: «اللهُمَّ إِنَّ إِبْرَاهِيمَ عَبْدُكَ وَخَلِيلُكَ وَنَبِيُّكَ وَإِنِّي عَبْدُكَ وَنَبِيُّكَ وَإِنَّهُ دَعَاكَ لِمَكَّةَ وَإِنِّي أَدْعُوكَ لِلْمَدِينَةِ بِمِثْلِ مَا دَعَاكَ لِمَكَّةَ وَمِثْلِهِ مَعَهُ»(صحیح مسلم) ''اے اللہ! بے شک ابراہیم علیہ السلام تیرے بندے، خلیل و نبی تھے اور میں بھی تیرا بندہ اور نبی ہوں بے شک ابراہیم علیہ السلام نے مکہ کے لیے دعا کی تھی جبکہ میں مدینہ کے لیے وہی دعا کرتا ہوں جو انھوں مکہ کے لیے کی تھی بلکہ میں مدینے کے لیے اتنا مزید کی دعا کرتا ہوں''۔

بہر حال کچھ یہاں رہنے کے سبب اور کچھ ان دعاؤں کی برکت سے مدینہ پاک نبی کریم ﷺ اور اصحاب کرام رضی اللہ

عنہم کو محبوب ہو گیا۔ امام بخاری نے الجامع الصحیح میں یہ باب باندھا ہے: بَابُ مَنْ أَسْرَعَ نَاقَتَهُ إِذَا بَلَغَ الْمَدِينَةَ "مدینہ کے نزدیک پہنچ کر اپنی سواری کو تیز کرنے کا بیان" اس کی ذیل میں آپ وہ روایت لے کر آئے ہیں جس میں آتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب سفر سے واپس آتے اور آپ ﷺ کو مدینہ کے آثار نظر آتے تو آپ اپنی سواری کی رفتا کو بڑھا دیتے۔ امام بخاری فرماتے ہیں کہ ایک دوسری روایت میں یہ اضافہ بھی ہے کہ «حَرَّكَهَا مِنْ حُبِّهَا» "مدینے کی محبت کی وجہ سے آپ اپنی سواری کو تیز حرکت میں لاتے" اس طرزِ عمل میں خاص طور پر تو مدینہ کی محبت کا ثبوت ہوتا ہے لیکن عمومی طور پر اس طرز عمل سے اپنے وطن کی محبت بھی ثابت ہوتی ہے۔ چناں چہ علامہ ابن حجر فرماتے ہیں: وَفِي الْحَدِيثِ دَلَالَةٌ عَلَى فَضْلِ الْمَدِينَةِ وَعَلَى مَشْرُوعِيَّةِ حُبِّ الْوَطَنِ والحَنِينِ إِلَيْهِ (فتح الباری) "یہ حدیث مدینہ کی فضیلت اور وطن کی محبت اور تڑپ کی مشروعیت پر دلالت کرتی ہے"۔ اس تفصیل سے یہ واضح ہوا کہ وطن کی محبت ایک جائز اور فطری امر ہے۔ اور یہ بھی ہم واضح کہنا چاہتے ہیں کہ بعض انقلاب پسند مذہبی عناصر جو ہر قسم کی حب الوطنی کو شرک پر محمول کرتے ہیں وہ ایک پر خلوص غلو کے سوا کچھ نہیں۔ پس وطن کی محبت کی مشروعیت کے بعد اس کی ترقی کی کوشش کرنا اور یہاں کے عوام کی فلاح و بہبود اور دیگر خدمت کے کام نہ صرف مشروع بلکہ مستحسن ہیں۔ یہ بات بھی اہم ہے کہ وطن کی بنیادی اور فطری محبت پر اضافی طور پر بعض ملکوں کو دینی فضیلت بھی حاصل ہوتی ہے جیسا کہ مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ اور بیت المقدس ہیں۔ ان سے کم تر فضیلت ان مسلمان ملکوں کو حاصل ہو گی جہاں اسلامی قانون نافذ اور حدود قائم و دائم ہیں۔ اس کے بعد عام مسلمان ملکوں کو درجہ بدرجہ فضیلت حاصل ہے۔ خاص طور پر وہ وطن جو اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا کہ ہم یہاں اسلام نافذ کر کے یہاں کے باشندوں کو امن و سکون عطا کریں گے اور دنیا کو اسلام کا صحیح چہرہ دکھائیں گے اس کی حرمت کچھ اور بڑھ جاتی ہے۔ اب ہم وطن کی محبت کے بارے میں دوسری انتہا کی طرف آتے ہیں بطور مثال اقبال کا قدیم شعر، اقبال پرستوں سے معذرت کے ساتھ عرض کرتے ہیں:

پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے ‏ ‏ ‏ ‏ خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرّہ دیوتا ہے

ملکِ پاکستان کے اکثر سیکیولر قائدین اور سیاست دان وطن کی محبت کے اسی تصور کے مطابق دعویدار ہیں جو اس شعر میں استعمال ہوا ہے اور ان میں سے اکثر اگر واقعی کسی خدا کو مانتے ہوتے تو وہ وطن ہی ہوتا۔ اب یہ لوگ وطن کی محبت میں جس پہلی برائی کا

شکار ہیں تو وہ غلو ہے۔ یہاں تک یہ لوگ متشدد ہیں کہ اگر کسی جماعت نے یا کسی دینی شخصیت نے پاکستان بننے سے پہلے کسی اصولی نظریے کی بنیاد پر اس کی مخالفت کی تھی اور یہ کہا تھا کہ نئے ملک کا بننا مسلمانوں اور اسلام کے لیے فائدہ مند نہ ہو گا تو ان کے اس جرم کو آج تک معاف نہیں گیا اور ان لیڈران کی طرف سے ہر اہم موقعے پر عوام کو ان شخصیات کا یہ "جرم" یاد کرایا جاتا ہے۔ حالاں کہ دین و شریعت کی رو سے وطن کی محبت اپنے جواز کے باوجود مطلق نہیں ہے بلکہ بعض اصولوں میں مقید ہے۔ یعنی وطن اور اس کی محبت کو ہر حال میں ترجیح نہیں دی جائے گی بلکہ بعض صورتوں میں دینی وجوہات کی بنا پر وطن کی محبت کو پس پشت بھی ڈالنا ہو گا جن کا ذکر ہم آگے چل کر کریں گے۔ مزید ستم یہ کہ اگر کسی سیاسی لیڈر نے بعض مقتدر طبقات کی طرف سے اپنے حقوق کی پامالی پر اعتراض کیا تو اسے ملک دشمن اور غدار قرار دے دیا گیا۔ خاکِ وطن کے ہر ذرے کو دیوتا ماننے والے ان سیکیولر عناصر کی دوسری برائی جو اصل برائی ہے وہ یہ کہ وہ اس دعوے میں بالکل جھوٹے ہیں۔ ہاں اگر اقبال نے یہ مصرع یوں کہا ہوتا: "بنکِ وطن کا مجھ کو ہر روپیہ دیوتا ہے" تو ان کا دعوی سچا ہوتا۔ تو غدارِ وطن وہ نہیں ہیں جو کسی مذہبی اصول پر "سب سے پہلے پاکستان" کے مخالف تھے۔ غدار وہ بھی نہیں ہیں جو پاکستان بننے سے پہلے اس کی بناوٹ پر تنقید کرتے تھے کہ یہ تو مسلمانوں کی طاقت کو تقسیم کیا جا رہا ہے۔ غدار وہ بھی نہیں تھے جو کہتے تھے کہ تم پاکستان کے نام پر آدھا ملک لے ہی نہیں رہے بلکہ بقیہ آدھا ملک چھوڑ بھی رہے ہو اور غدار وہ بھی نہیں تھے جو کہتے تھے کہ اسلام کا جو قلعہ تم بنانے چلے ہو، تمھارے پاس نہ مستری ہیں نہ مسالا، تو کہاں سے بناؤ گے۔ غدارِ وطن تو وہ ہیں جو وطن کی محبت کے نام پر اسے لوٹ کھسوٹ رہے ہیں۔ ایک وہ جو احتساب کے نام پر خلافتِ راشدہ قائم کرنے آیا، اپنے ساتھ چوروں کا ایک ٹولہ لے کر آیا، یا بقول شخصے جسے چور لائے تھے۔ اس حکومت کو دیکھ کر تو ہمیں بچوں کی پرچی والا کھیل "چور سپاہی وزیر" یاد آجاتا ہے کہ پرچی بدلنے سے کبھی چور سپاہی بنتا ہے اور کبھی وزیر! "ریاستِ مدینہ" کا تخت سنبھالنے سے پہلے جنھیں ڈاکو قرار دیا گیا انھی کو بعد میں وزیر بنوانے کی تگ و دو شروع ہوئی۔ سائیکل پر دفتر آنے کی مثالیں دے کر، ہوائی سفر کو ترجیح دی گئی۔ اربوں روپے کے چور پکڑے تو ان سے چند لاکھ میں مک مکا کر لیا۔ اب دوسری طرف کے حالات بھی ایسے ہی ہیں۔ انھی پالیسیوں کو جاری رکھا ہوا ہے جو پچھلی حکومت میں جاری و ساری تھیں۔ اب کہنا یہ ہے کہ وطن کی محبت کیا جھوٹ فراڈ، ہارس ٹریڈنگ کا نام ہے یا یہ چیزیں ملک کے لیے نقصان دہ ہیں۔ کیا

ملک عزیز میں اسلامی قوانین کے راستے میں رکاوٹیں ڈالنا، منظور شدہ قوانین کے نفاذ کو مشکل بنانے کے لیے انتظامی تخریب کاری کرنا اور اسلامی اقدار کو پامال کرنا، کیا ملک کی محبت اسی کو کہتے ہیں۔ بیرونی قرضے تم نے لیے، اندرونی قرضے اپنے منظور نظر لوگوں کو تم نے معاف کیے۔ تنخواہ اور بھاری بھرکم مراعات کے نام پر "قرض کی شراب" تم پیتے ہو۔ ریٹائرڈ سورماؤں کو کرپشن کے راستے تم دیتے ہو۔ کرپٹ سیاست دانوں کو اپنی پارٹی میں لا کر ٹکٹ سے تم نوازتے ہو۔ ملک کو گروی تم رکھتے ہو تو معصوم سا سوال ہے کہ غداری آخر کس کو کہتے ہیں؟ تم ہی ننگِ دین و ننگِ وطن ہو جو وطن کی محبت کے نام پر ہم وطنوں کو بے وقوف بناتے ہو! یاد رہنا چاہیے کہ اسلام کے نام پر حاصل کیے گئے ملک سے غداری اسلام سے غداری کے برابر ہے۔

اب ہم وطن کی محبت کے بارے میں وہ دینی اصول بیان کریں گے جن میں وطن کی محبت کو محدود کیا گیا ہے اور دینی ضرورت کو اس پر ترجیح دی گئی ہے۔ حدیث میں وہ واقعہ بیان ہوا ہے کہ جب ایک شخص نے سو قتل کر دیے تو اسے توبہ سکھانے والے عالم نے اس سے فرمایا: انْطَلِقْ إِلى أرضِ كَذَا وكَذَا فإِنَّ بِهَا أُناسًا يَعْبُدُونَ الله تَعالَى فاعْبُدِ الله مَعَهُمْ ولاَ تَرْجِعْ إِلى أَرْضِكَ فَإِنَّهَا أرضُ سُوءٍ (مُتَّفَقٌ عليه) "فلاں بستی کی طرف چلے جاؤ کہ وہاں کچھ ایسے لوگ آباد ہیں جو اللہ کی عبادت کرتے ہیں تم ان کے ساتھ مل کر اللہ کی عبادت کرو اور اپنی بستی کی طرف نہ لوٹنا اس لیے کہ یہ ایک بری زمین ہے" اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ دین و عبادت کی وجہ سے وطن کی محبت کو قربان کرنا چاہیے۔

قرآن کریم میں آتا ہے کہ شیطان نے چیلنج دیا تھا کہ اے اللہ میں تیرے راستوں پر گھات لگا کر انسانوں کو گمراہ کروں گا۔ حدیث میں اس کی چند مثالیں آئی ہیں کہ جب بندہ اسلام قبول کرنے لگتا ہے تو شیطان اس سے کہتا ہے کہ کیا تو اسلام لا کر اپنے اور اپنے اباواجداد کے دین کو چھوڑ رہا ہے۔ اور جب انسان ہجرت کرتا ہے تو شیطان اس کے دل میں وسوسہ ڈالتا ہے اور کہتا ہے: تُهَاجِرُ وَتَدَعُ أَرْضَكَ وَسَمَاءَكَ؟ أَوَإِنَّمَا مَثَلُ الْمُهَاجِرِ كَمَثَلِ الْفَرَسِ فِي الطِّوَلِ "کیا تو ہجرت کر کے اپنی زمین اور اپنا فضا کو چھوڑ رہا ہے اور مہاجر کی مثال تو طویلے میں بندھے گھوڑے کی مانند ہے"۔ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں: «فَعَصَاهُ فَهَاجَرَ» "پس بندہ شیطان کی نافرمانی کرتا ہے اور ہجرت کر گزرتا ہے" اس حدیث کے آخر

میں آتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:«فَمَنْ فَعَلَ ذَلِكَ كَانَ حَقًّا عَلَى اللهِ -عَزَّ وَجَلَّ- أَنْ يُدْخِلَهُ الْجَنَّةَ» ”جو کوئی بھی یہ طرزِ عمل اختیار کرے تو اللہ کے ذمے ہے کہ وہ اسے جنت میں داخل کرے“ تو ان الفاظ میں شیطان کی نافرمانی کر کے دین کے تقاضے کو وطن کی محبت پر ترجیح دینے کی تحسین کی گئی ہے تو معلوم ہوا کہ اگر وطن کی محبت، دین کے آڑے آ رہی ہو تو دین کو ترجیح دی جائے گی نہ کہ وطن کو اور وطن کو ترجیح دینا شیطانی وسوسہ ہے اور اس وسوسے کو رد کرنا ہی دینی رویہ ہے۔وطن کی محبت کا یہی دینی تصور ہے جو اقبال کے ہاں وطنیت میں ملتا ہے:

ہے ترکِ وطن سنتِ محبوبِ الٰہی　　　　دے تو بھی نبوت کی صداقت کی گواہی

نبوت کی صداقت کی گواہی ترکِ وطن کی صورت میں دینے کی نوبت وہاں آئے گی جہاں ہجرت ”وجوب“ کے درجے میں ہو۔فرمانِ نبوی«لاَ هِجْرَةَ بَعْدَ الفَتْحِ» (صحیح بخاری)”فتح کے بعد ہجرت نہیں رہی“ اس کا ایک خصوصی مطلب بھی ہے لیکن عمومی راہنمائی اس سے یہ ملتی ہے کہ فَلَا تَجِبُ الْهِجْرَةُ مِنْ بَلَدٍ قَدْ فَتَحَهُ الْمُسْلِمُونَ (فتح الباری)”پس کسی بھی شہر سے ہجرت کرنا واجب نہیں ہے جب کہ مسلمان اسے فتح کر چکے ہوں“ تو اب اہلِ پاکستان کے لیے ہجرت کی یہ صورت تو باقی نہیں رہی البتہ نبوت کی صداقت کی گواہی ہجرت کی ایک دوسری قسم سے دی جا سکتی ہے بلکہ ضرور ہی دینی چاہیے۔ رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا کہ افضل ہجرت کیا ہے تو فرمایا:«أَنْ تَهْجُرَ مَا كَرِهَ رَبُّكَ عَزَّ وَجَلَّ»(مسند احمد) کہ ”تو اللہ کے ناپسندیدہ کو ترک کر دے“ تو اہلِ پاکستان وہ جو وطن کی محبت کے داعی و شیدائی ہیں ان کے لیے کرنے کا پہلا کام تو یہ ہے کہ اللہ کی نافرمانی کو ترک کریں اور دوسرا یہ کہ وطن کی محبت سے سرشار ہو کر وطن کی فلاح و بہبود کے لیے کام کریں، وطن عزیز کی دینی و مذہبی بنیادوں کو مضبوط کریں اور اسے اسلام کا گہوارا بنانے کی کوشش کریں عوام ہوں یا حکمران سب سے ہماری عرض یہی ہے کہ وطن کی محبت کا بہانہ بنا کر اسلام کی راہ میں روڑے نہ اٹکائے جائیں۔

بازو تیرا توحید کی قوت سے قوی ہے　　　　اسلام تیرا دیس ہے تو مصطفوی ہے

نظارہ دیرینہ زمانے کو دکھا دے　　　　اے مصطفوی خاک میں اس بت کو ملا دے

****

مولانا محمد اقبال
رکن شعبہ تحقیق و تصنیف

علم اور اہلِ علم کا مقام اور ذمے داریاں

سورۃ الزمر آیت:۹

﴿أَمَّن هوَ قَانِتٌ اٰنَاءَ الَّيلِ سَاجِدًا وَّ قَائِمًا يَّحذَرُ الاٰخِرَةَ وَ يَرجُوا رَحمَةَ رَبِّه، قُل هَل يَستَوِی الَّذِينَ يَعلَمُونَ وَ الَّذِينَ لَا يَعلَمُونَ، إِنَّمَا يَتَذَكَّرُ أُولُوا الأَلبَابِ﴾

"بھلا (کیا ایسا شخص اس کے برابر ہو سکتا ہے) جو رات کی گھڑیوں میں عبادت کرتا ہے، کبھی سجدے میں، کبھی قیام میں، آخرت سے ڈرتا ہے، اور اپنے پروردگار کی رحمت کا امیدوار ہے ؟ کہو کہ: کیا وہ جو جانتے ہیں اور جو نہیں جانتے سب برابر ہیں ؟ (مگر) نصیحت تو وہی لوگ قبول کرتے ہیں جو عقل والے ہیں"۔

تفسیر و توضیح

علم کی فضیلت و عظمت محتاجِ بیان نہیں ہے، اس کی ترغیب و تاکید قرآن کریم میں جس دل آویز انداز میں آئی ہے اس کی نظیر نہیں ملتی۔ قرآن کریم کی پہلی وحی جو اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ پر نازل فرمائی وہ علم ہی سے متعلق ہے۔ پہلی وحی کا آغاز جس کلمے سے ہوا ہے وہ ہے: ﴿اِقْرَأْ﴾ یعنی "پڑھ"۔ اسی پہلی وحی میں علم اور قلم کا رشتہ بھی واضح فرمایا ہے: ﴿اقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ، الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ، عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ﴾ (سورۃ العلق) "پڑھو، اور تمھارا پروردگار سب سے زیادہ کرم والا ہے، جس نے قلم سے تعلیم دی۔ انسان کو اس بات کی تعلیم دی جو وہ نہیں جانتا تھا"۔ لہذا ان آیاتِ مبارکہ سے جہاں علم

اور آلات علم کی اہمیت اور عظمت ظاہر ہوتی ہے، وہاں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ تعلیم وتربیت اس دینِ مبین کا بنیادی مقصد ہے۔کیونکہ انسان اور دیگر مخلوقات میں فرق علم اور اس کے مقتضیات پر عمل ہی سے ممکن ہے۔ چنانچہ زیرِ مطالعہ آیتِ مبارکہ میں علم اور اس کے مقتضیات پر عمل کرنا دونوں لازم وملزوم قرار دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ﴿أَمَّنۡ هُوَ قَانِتٌ اٰنَآءَ الَّيۡلِ سَاجِدًا وَّ قَآئِمًا يَّحۡذَرُ الۡاٰخِرَةَ وَ يَرۡجُوۡا رَحۡمَةَ رَبِّهٖ﴾ ”بھلا (کیا ایسا شخص اس کے برابر ہوسکتا ہے) جو رات کی گھڑیوں میں عبادت کرتا ہے، کبھی سجدے میں، کبھی قیام میں، آخرت سے ڈرتا ہے، اور اپنے پروردگار کی رحمت کا امیدوار ہے؟“ آیتِ مبارکہ کے اس حصے میں جس شخص کا تذکرہ کیا گیا ہے کہ جو اپنے پروردگار کی رحمت کی امید پر رات کی گھڑیوں میں عبادت میں مصروف رہتا ہے، اس کے مصداق میں مختلف اقوال ہیں؛ مشہور مفسرِ قرآن حضرت مقاتل رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: اس آیت میں رات میں عبادت کرنے والے سے مراد؛ عمار، صہیب، ابن مسعود اور ابوذر رضی اللہ عنہم ہیں۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: اس سے مراد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ہیں، جبکہ ضحّاک کی روایت سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: اس سے مراد حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہما ہیں۔ یحیٰ بن سلام کہتے ہیں: اس سے مراد رسول اللہ ﷺ ہی ہیں۔ (البحر المحيط في التفسير، ج:۹، ص:۱۸۹) اسی طرح واضح ہوتا ہے کہ مذکورہ شخص عبادت میں اس لیے مصروف رہتا ہے کہ اس کے پاس علم ہے اور علم کا مطلب ہی یہ ہے کہ اس کے مقتضیات پر عمل کیا جائے۔ چنانچہ اسی قانت اور عابد کو بطورِ مثال پیش کیا کہ ایسے اہلِ علم اور جہلا انجامِ کار کے اعتبار سے برابر کیسے ہوسکتے ہیں؟ امام ابو سعود رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ﴿قُلۡ﴾ بيانًا للحقِّ وتنبيهًا على شرفِ العلمِ والعمل ﴿هَلۡ يَسۡتَوِى الذين يَعۡلَمُونَ﴾ حقائقَ الأحوالِ فيعملون بموجبِ علمهم كالقانتِ المذكورِ ﴿والذين لاَ يَعۡلَمُونَ﴾ (تفسير أبي السعود، ج:۷، ص:۲۴۵) ”حقیقت کی وضاحت اور علم وعمل کے شرف کی غرض سے فرمادیجیے! کہ: کیا وہ لوگ جو علم والے ہیں یعنی احوال کی حقیقتوں سے باخبر ہیں اور اپنے علم کے مقتضیٰ پر عمل کرنے والے ہیں جیسے کہ آیتِ مبارکہ میں مذکورہ عبادت گزار کی مثال دی گئی ہے، وہ اور جو جاہل ہیں سب برابر ہیں؟ یعنی جو اپنی جہالت اور گمراہی کے مقتضیٰ پر عمل کرنے والے ہیں، سب برابر ہیں؟“ یعنی اگر آخرت کا حساب و

کتاب نہ ہو اور اچھے اور برے کاموں کی جزاو سزا کا نظام نہ ہو پھر عالم جاہل، مومن کافر سب برابر ہو جائیں گے، جو ظاہر ہے اللہ تعالیٰ کی حکمت اور انصاف سے بعید ہے۔

﴿قُل هَل يَستَوِى الَّذِينَ يَعلَمُونَ وَ الَّذِينَ لَا يَعلَمُونَ، إِنَّمَا يَتَذَكَّرُ أُولُوا الأَلبَابِ﴾ ''کہو کہ: کیا وہ جو جانتے ہیں اور جو نہیں جانتے سب برابر ہیں؟ (مگر) نصیحت تو وہی لوگ قبول کرتے ہیں جو عقل والے ہیں''۔ آیتِ مبارکہ کے اس حصے میں عالم اور جاہل کے فرق کو واضح کیا گیا ہے کہ جاننے والے اور نہ جاننے والے برابر نہیں ہو سکتے، کیونکہ انسان کو دیگر مخلوقات پر فوقیت اسی لیے دی گئی ہے کہ اس کے اندر علم حاصل کرنے اور اس پر عمل کرنے کی صلاحیت رکھی گئی ہے جبکہ باقی مخلوقات میں یہ اہلیت نہیں ہوتی۔ اب اگر انسان علم حاصل نہیں کرتا تو اس کے اور دیگر مخلوقات کے درمیان اس لحاظ سے مشابہت پیدا ہوتی ہے جو اس کی امتیازی شان کے خلاف ہے۔ چنانچہ علم ہی ایک ایسی چیز ہے جو انسان کو خیر اور شر میں فرق سکھاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم کی نظر میں صاحب علم کا مخصوص مقام متعیّن ہے۔ لہذا آیتِ مبارکہ کے اس حصے میں بتلایا گیا ہے کہ عالم اور جاہل برابر نہیں ہو سکتے۔ قرآن حکیم کے ساتھ بے شمار احادیث مبارکہ میں مسلمانوں کو حصول علم کے لیے ترغیب دی گئی ہے۔ ایک حدیث مبارکہ میں فرمایا گیا ہے: «إِنَّ الْعُلَمَاءَ هُمْ وَرَثَةُ الْأَنْبِيَاءِ، وَرَّثُوا الْعِلْمَ، مَنْ أَخَذَهُ أَخَذَ بِحَظٍّ وَافِرٍ» (بخاری شریف) ''بیشک اہلِ علم؛ انبیاے کرام علیہم السلام کے وارث ہیں، انھوں نے میراثِ علم چھوڑی ہے۔ پس جس نے اس میراث کو حاصل کیا، اس نے بہت بڑا حصہ پا لیا''۔ اس حدیثِ مبارکہ میں علم کو انبیاے کرام کی میراث قرار دیا گیا ہے اور ظاہر ہے اس میراث میں حصہ پانے اور محروم ہونے والے برابر نہیں ہو سکتے۔

اسی طرح محض معلومات جمع کرنا علم نہیں ہے بلکہ اس علم کے مقتضیات پر عمل کرنا بھی اس کا حصہ ہے، چنانچہ صاحبِ تفسیرِ قاسمی آیتِ مذکورہ کی تفسیر میں علامہ قاشانی رحمہ اللہ کا قول نقل فرماتے ہیں کہ: ''عالم فقط وہی ہے جو فرماں بردار ہو، اس لیے کہ علم وہی ہے جو دل میں ایسا گھر کر لے اور روح میں اس طور رچ بس جائے کہ اس کی مخالفت ممکن ہی نہ رہے، بلکہ اس کے گوشت اور خون کا حصہ بن جائے۔ اسی طرح علم کا اثر اس کے اعضا و جوارح میں ایسا ظاہر ہو جائے کہ اس کے مقتضیٰ سے اسے الگ کرنا ممکن نہ رہے۔ اور اگر علم کی صفت یہ نہ ہو تو یہ محض نقوش ہیں جو خیالی چیز ہیں، اس لیے کہ ان کا ذہول اپنے مقتضیات

سے ممکن ہے جو حقیقت میں علم نہیں ہے بلکہ یہ تو امرِ تصوری اور عارضی خیال ہے جو جلد زائل ہونے والا ہے۔ یہ امرِ تصوری اور عارضی خیال قلب کے لیے غذا کا کام نہیں دے سکتا اور نہ ہی بھوک مٹانے میں مدد گار ہے۔ "علم" سے اصحابِ عقل ہی نصیحت حاصل کرتے ہیں، یعنی وہ لوگ جن کی عقول تخیل اور وہم کے چھلکے سے صاف ہیں، اس لیے کہ علم راسخ کی نشانی یہ ہے کہ یہ ظاہری اعضا پر اثر انداز ہوتا ہے۔ (تفسیر القاسمی، ج:۸ص:۲۸۲) اسی طرح امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ علم اور عمل دونوں مقصود ہیں اور ان دونوں میں عمل کو پہلا درجہ حاصل ہے: واعلم أن هذه الآية دالة على أسرار عجيبة، فأولها: أنه بدأ فيها بذكر العمل وختم فيها بذكر العلم، أما العمل فكونه قانتا ساجدا قائما، وأما العلم فقوله: هل يستوي الذين يعلمون والذين لا يعلمون وهذا يدل على أن كمال الإنسان محصور في هذين المقصودين، فالعمل هو البداية والعلم والمكاشفة هو النهاية. (التفسیر الکبیر، ج:۲۶، ص:۴۲۸) "جان لیجیے کہ یہ آیت کئی عجیب وغریب اسرار وحِکَم پر مشتمل ہے؛ پہلا یہ ہے کہ یہاں عمل کے ذکر سے آغاز کر دیا ہے جبکہ اختتام علم کے تذکرے پر کیا ہے۔ عمل یعنی رات کی گھڑیوں میں عبادت کرنا، نماز پڑھنا وغیرہ، اور علم یعنی اللہ تعالیٰ کا قول؛ کیا وہ جو جانتے ہیں اور جو نہیں جانتے سب برابر ہیں؟ کا ذکر کرنا، یہ دلالت کرتا ہے کہ انسان کا کمال ان دو مقصود میں محصور ہے، پس پہلا مقصود عمل ہے اور آخری علم ومکاشفہ ہے"۔

زیرِ نظر آیتِ مبارکہ کا حاصل یہ ہے کہ ایک انسان کے لیے ایمان لانے کے بعد سب سے زیادہ انفع چیز علم ہے، اس کے ذریعے وہ نہ صرف اپنے آپ کو جہنم کی ہولناکیوں سے بچاتا ہے، بلکہ دوسرے لوگوں کے لیے ہدایت کا ذریعہ بھی بنتا ہے۔ اسی طرح دین کی اشاعت وحفاظت کا مدار بھی علم ہے۔ لیکن یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ جس طرح اہلِ علم کا مقام ومرتبہ اعلیٰ وبلند ہے اسی طرح ان کی ذمے داریاں بھی بہت نازک ہیں۔ ان میں سے سب سے زیادہ ضروری اور اہم یہ ہے کہ اپنے علم کے مقتضیات پر خود بھی عمل کریں اور حسبِ استطاعت اس علم کی نشر واشاعت میں بھی حصہ لیں۔ اسی طرح اپنے مقامِ بلند اور اپنے فضائل کی رعایت کرتے ہوئے اپنی مفوّضہ ذمے داریوں سے تغافل نہ برتیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں صحیح معنوں میں علم حاصل کرنے کی سچی لگن، اس کے مقتضیات پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائیں اور اس کی خدمت کے لیے ہمیں قبول فرمائیں۔ آمین

****

ابنِ عباس
معاون قلم کار

کامیاب انسان کے اوصاف

عَنْ أَبِي ذَرٍّ رضي الله عنه أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «قَدْ أَفْلَحَ مَنْ أَخْلَصَ (اللهُ) قَلْبَهُ لِلْإِيمَانِ وَجَعَلَ قَلْبَهُ سَلِيمًا وَلِسَانَهُ صَادِقًا وَنَفْسَهُ مُطْمَئِنَّةً وَخَلِيقَتَهُ مُسْتَقِيمَةً وَجَعَلَ أُذُنَهُ مُسْتَمِعَةً وَعَيْنَهُ نَاظِرَةً فَأَمَّا الْأُذُنُ فَقَمِعٌ وَالْعَيْنُ مُقِرَّةٌ بِمَا يُوعَى الْقَلْبُ وَقَدْ أَفْلَحَ مَنْ جَعَلَ قَلْبَهُ وَاعِيًا» (مسند احمد، شعب الایمان)

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”یقیناً وہ شخص کامیاب ہو گیا جس نے اپنے قلب کو ایمان کے لیے خالص کر لیا اور اس نے اپنے دل کو سلیم و صحیح بنایا اور اپنی زبان کو سچا بنایا اور اپنے نفس کو مطمئن رکھا اور اپنے اخلاق کو مستقیم کیا اور اپنے کانوں کو (مستمع) توجہ سے سننے والا بنایا اور اپنی آنکھوں کو دیکھنے والا بنایا جہاں تک کانوں کی بات ہے تو اس کی مثال قیف سی ہے اور آنکھ پیوست کرنے والی ہے ان چیزوں کو جنھیں دل یاد رکھتا ہے اور مقرر تحقیق کہ جس نے اپنے دل کو یادداشت رکھنے والا بنایا“۔

تشریح

تعمیرِ شخصیت اور تزکیہ نفس کے اعتبار سے یہ ایک عظیم الشان حدیث ہے۔ ہم اس کو حصوں میں تقسیم کرکے اس کے مفہوم کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حدیث پاک کے پہلے حصے میں انسان کی کامیابی کی لازمی اور بڑی شرط ایمانِ خالص کا ذکر کیا گیا۔ دوسرے حصے میں ایمان کے کچھ ثمرات اور ایمان کی بنیاد پر شخصیت میں پیدا ہونے والی چند صفات کا ذکر کیا گیا۔

اس اعتبار سے یہ حدیث سورۃ المومنون کی ابتدائی آیات کے مشابہ ہے۔ جہاں ﴿قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ﴾ ''تحقیق کامیاب ہوئے ایمان والے'' فرمانے کے بعد ایمانی صفات و اعمال بیان کیے گئے ہیں۔ حدیثِ مبارکہ کے آخری حصے میں ایمان کی تروتازگی اور پختگی کے چند ذرائع اور اشارۃ ایک لائحہ عمل کا ذکر کیا گیا۔

«قَدْ أَفْلَحَ مَنْ أَخْلَصَ قَلْبَهُ لِلْإِيمَانِ » یہ حدیث کا پہلا جملہ ہے جو مسند احمد کی روایت کے مطابق ہے۔ نحوی ترکیب کی رو سے فعل أَفْلَحَ کا فاعل مَنْ بنتا ہے چناں ترجمہ یوں ہو گا: ''تحقیق کامیاب ہوا وہ شخص جس نے اپنے دل کو ایمان کے لیے خالص کیا''۔ لیکن شعب الایمان کی روایت میں جو مشکاۃ میں بھی منقول ہے لفظ اللہ کا اضافہ ہے اور پہلا جملہ یوں ہے «قَدْ أَفْلَحَ مَنْ أَخْلَصَ اللهُ قَلْبَهُ لِلْإِيمَانِ» اس ترکیب میں أَخْلَصَ کا فاعل اسم جلالہ اللہ بنتا ہے اس ترکیب کے مطابق ترجمہ یوں ہو گا: ''کامیاب ہوا وہ شخص جس کے دل کو اللہ نے ایمان کے لیے خالص کر دیا''۔ دونوں صورتوں میں نتیجے کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں پڑتا اس لیے کہ ہر انسان نے خود محنت کر کے اپنے دل کو خالص کرنا ہے اس اعتبار سے وہ فاعل خود ہے جسے اصطلاح میں ''کاسِب'' کہا جاتا ہے جبکہ اخلاص قلب اور ایمان کی توفیق دینا اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے اس اعتبار سے فاعلِ حقیقی یا ''خالقِ اخلاص'' اللہ تعالیٰ ہے۔ تو روایتوں کے اس لفظی فرق سے اخلاص کے عمل کا پورا تصور سامنے آجاتا ہے کہ انسان نے اللہ تعالیٰ کی ہمت و توفیق سے محنت کر کے اپنے دل کو خالص اور اپنے ایمان کو مضبوط بنانا ہے۔ اس کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا بھی مانگتے رہنا چاہیے جیسا کہ ایک مسنون دعا میں یہ الفاظ آتے ہیں: «اللَّهُمَّ رَبَّنَا وَرَبَّ كُلِّ شَيْءٍ اِجْعَلْنِي مُخْلِصًا لَكَ وَأَهْلِي فِي كُلِّ سَاعَةٍ فِي الدُّنْيَا وَالآخِرَةِ» (سنن ابی داؤد) ''اے اللہ! ہمارے اور ہر چیز کے رب مجھے اور میرے گھر والے کو اپنے لیے خالص کر دے دنیا اور آخرت کی ہر گھڑی میں''۔

«وَجَعَلَ قَلْبَهُ سَلِيمًا» قلبِ سلیم سے مراد وہ بھلا چنگا دل ہے جو باطنی امراض مثلاً حسد و کینہ دوسرے اخلاق ذمیمہ اور احوال ردیئہ سے پاک ہو جو حب دنیا اور مولیٰ حقیقی اور آخرت کی غفلت سے سے محفوظ ہو۔ سورہ الشعراء میں ابراہیم علیہ السلام کے تذکرے میں آخرت کی کامیابی کے حوالے سے فرمایا گیا: ''جس دن کسی کو مال و اولاد کام نہ دے گی سوائے اس

کے، کہ جو قلبِ سلیم لے کر آئے"۔ سورۃ ق آیت ۳۳ میں جنت کے مستحق متقین کی صفات میں اس صفت کا ذکر ہوا ہے: ﴿مَنْ خَشِيَ الرَّحْمَنَ بِالْغَيْبِ وَجَاءَ بِقَلْبٍ مُنِيبٍ﴾ "جو اپنے رب سے بن دیکھے ڈرتا رہا اور قلبِ منیب (رجوع کرنے والا دل) لے کر حاضر ہوا" احادیث میں ایسے صاف ستھرے دل کو قلب مخموم کا نام دیا گیا۔

«وَلِسَانَهُ صَادِقًا» سچی زبان میں قول اور وعدے دونوں کی سچائی شامل ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ سچ انسان کو نیکی کی طرف لے جاتا ہے اور نیکی جنت کی طرف اور انسان پابندی سے سچ بولتا رہتا ہے یہاں تک کہ اللہ کے ہاں صدیق لکھ دیا جاتا ہے"۔

«وَنَفْسَهُ مُطْمَئِنَّةً» "اور اس نے اپنے نفس کو بنایا نفس مطمئن" جب انسان سچ کو اختیار کرے گا تو اسے نیکی کی توفیق ملے گی۔ اس کے نتیجے میں انسان کو اطمینان حاصل ہو گا۔ جیسا کہ ترمذی کی روایت میں آتا ہے: "بے شک سچائی اطمینان کا باعث ہے" اور مسندِ احمد کی روایت میں فرمایا: "نیکی وہ ہے جس کی طرف نفس اطمینان محسوس کرے اور جس کی طرف قلب بھی مطمئن ہو جائے"۔ ملا علی القاری نے اس موقعے پر خاص طور پر اللہ تعالی کے ذکر کو لازم پکڑنے کی طرف اشارہ کیا ہے اس لیے کہ وہ دلوں کے اطمینان کا ایک بڑا ذریعہ ہے۔ نفس مطمئن، رب کی رضا اور تقدیر پر راضی رہتا ہے۔ اسی طرح رب کی ربوبیت، نبی کی نبوت اور اسلام کی حقانیت پر راضی رہتا ہے۔ آخرت کو اپنا مطلوب و مقصود بنا کر اور اس کے لیے قربانیاں دے کر بھی وہ پریشان نہیں ہوتا بلکہ مطمئن رہتا ہے۔

«وَخَلِيقَتَهُ مُسْتَقِيمَةً» "اور اس نے اپنی خلقت یا طریقے کو مستقیم کیا"۔ خلیقہ سے جبلت و فطرت بھی مراد لی گئی یعنی وہ ودیعت کردہ فطری صلاحیتِ خیر و شر پر گامزن ہے اور کسی افراط و تفریط کا شکار نہیں ہوتا۔ خلیقہ سے مراد، اخلاق و عادات و اطوار بھی لی گئی ہیں کہ اس کے اخلاق و عادات اور اعمال سنت و شریعت کے مطابق ہوتے ہیں جو ظاہر ہے سلامتی فطرت کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ پس انسان کو ہر معاملے میں سنت و شریعت کو ترجیح دینی چاہیے اور فطرت کے نزدیک تر رہنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

«وَجَعَلَ أُذُنَهُ مُسْتَمِعَةً وَعَيْنَهُ نَاظِرَةً فَأَمَّا الْأُذُنُ فَقَمِعٌ وَالْعَيْنُ مُقِرَّةٌ (نَاظِرَةً) بِمَا يُوعَى الْقَلْبُ وَقَدْ أَفْلَحَ مَنْ

جَعَلَ قَلْبَهُ وَاعِيًا» بقول ملا علی القاری حدیث کے آخری حصے میں آلات و اسبابِ علم کا ذکر فرمایا گیا۔ جیسا کہ سورۂ بنی اسرائیل آیت ۳۶ میں فرمایا: ”بے شک سمع و بصر اور دل و دماغ ان سب کے بارے میں پوچھا جائے گا“۔ دنیا میں ہر طرف اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کی نشانیاں پھیلی ہوئی جو کائناتی اور آفاقی بھی ہیں اور انفسی بھی۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ”ہم عنقریب انھیں دکھائیں گے اپنی نشانیاں کائنات میں بھی اور خود ان کی جانوں میں بھی“۔ (فصلت: ۵۳) ان نشانیوں میں سے کچھ بصری ہیں اور کچھ سمعی اور بعض عقلی ہیں۔ ان تینوں قسم کی نشانیوں کو پہچاننے کے لیے انسان کو کان، آنکھ اور دل دیے ہیں۔ انھیں آلاتِ علم کہا جاتا ہے انھیں آلاتِ آیات بھی کہا جاسکتا ہے۔ قرآن کریم میں متعدّد مقامات پر ان کے استعمال کی طرف متوجہ کیا گیا ہے: سورۃ النحل آیت ۷۸ میں فرمایا: ”اور اللہ نے تمھیں اس حال میں ماؤں کے پیٹوں سے نکالا کہ تم کچھ نہیں جانتے تھے اور اس نے تمھارے لیے سمع و بصر اور دل و دماغ بنائے تاکہ تم شکر کرو“۔ سمع و بصر دل و دماغ سے کام نہ لینے والوں کی شدید مذمت قرآن کریم میں کی گئی ہے فرمایا: ”ان کے دل ہیں جن سے وہ سمجھتے نہیں ان کی آنکھیں ہیں جن سے وہ دیکھتے نہیں ان کے کان ہیں جن سے وہ سنتے نہیں ایسے لوگ تو جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی گئے گزرے یہی ہیں وہ جو غافل ہیں“۔ (الانعام: ۱۷۹)

«وَجَعَلَ أُذُنَهُ مُسْتَمِعَةً» ”بنایا اس نے اپنے کانوں کو توجہ سے سننے والا“ استماع، توجہ اور اہتمام سے سننے کو کہتے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ انسان سمعی نشانیوں، نصیحتوں اور خدائی احکامات کو توجہ سے سننے والا ہو۔ حق بات اور ذات حق کی نشانیوں سے اعراض نہ کرے۔ یہ ایک اہم صفت ہے۔ سورۃ الحاقہ میں کشتیٔ نوح علیہ السلام کے تذکرے میں فرمایا: ”تاکہ ہم اسے یاددہانی بنادیں اور اسے یاد رکھنے والا کان“۔ سورۂ ق آیت ۳۷ میں نصیحت پکڑنے والوں کی صفت یوں بیان کی گئی: ”بے شک اس میں البتہ نصیحت ہے اس کے لیے کہ جس کے پاس (زندہ) دل ہو اور وہ کان لگا کر سنے اور وہ متوجہ ہو“۔ پس انسان کو چاہیے کہ نیکی کی بات، نصیحت کی بات، وعظ و تلقین وغیرہ کو دل لگا کر توجہ سے سننے کی کوشش کرے۔ اگر کسی وجہ سے طبیعت سننے پر آمادہ نہیں ہے تو جبر کر کے سننے کی کوشش کرے۔ اس محنت کی برکت سے اللہ تعالیٰ طبیعت کو آمادہ کر دیتے ہیں۔ اس لیے کہ اس کا وعدہ ہے کہ جو ہمارے لیے محنت کرے اسے اپنے راستوں کی ہدایت دیں گے“۔

«وَعَيْنَهُ نَاظِرَةً» اور اس کی آنکھ کو بنایا دیکھنے والی‘‘ یہاں بھی دیکھنے سے مراد مجرد حیوانی دیکھنا نہیں ہے بلکہ مراد ہے توجہ سے دیکھنا اور چیزوں کی حقیقت کو سمجھنے اور ان کے موازنے سے عبرت حاصل کرنے کی کوشش کرنا اور اللہ کی نشانیوں پر غور کی نظر کرنا مراد ہے۔ سورۃ السجدہ آیت ۲۷ میں کائناتی نشانیوں پر گہری نظر کرنے کی ترغیب دلاتے ہوئے فرمایا گیا: ’’کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ ہم پانی کو ہانک دیتے ہیں بنجر زمین کی طرف پھر اس پانی سے ہم کھیتیاں اگاتے ہیں جس سے ان کے چوپائے اور یہ خود بھی کھاتے ہیں کیا یہ لوگ دیکھتے نہیں ہیں‘‘۔ نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم دیا ’’کہ میری نظر مبنی بر موعظت و عبرت ہو‘‘ شمائل شریف میں رسول اللہ ﷺ کے بارے میں آتا ہے کہ ’’آپ ﷺ دائمی طور پر فکر و اعتبار میں مشغول رہا کرتے تھے‘‘۔ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں: ’’اللہ کی مخلوقات میں غور و فکر کیا کرو‘‘۔ (الجامع الصحیح) کئی بزرگوں اور بعض اصحابِ کرام نے تفکر کو عبادت قرار دیا ہے اس لیے کہ یہ انسان کو عبادت کے لیے تیار اور اس کے ایمان کو روشنی دیتا ہے۔ چناں چہ جب ام الدرداء رضی اللہ عنہا سے پوچھا گیا کہ حضرت ابوالدرداء کی افضل عبادت کیا تھی تو فرمایا: التفکر والاعتبار ’’غور و فکر‘‘۔ (کتاب الزہد، امام احمد) افسوس جدید آلات اور ٹیکنالوجی نے انسان کو اس درجہ مصروف کر دیا کہ عبادت کی یہ قسم انسان سے متروک ہی ہو گئی۔ لیکن بہرحال کچھ وقت اس کام کے لیے رکھنا چاہیے۔

اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے کان اور آنکھ کا قلب کے ساتھ تعلق واضح فرمایا:

«فَأَمَّا الْأُذُنُ فَقَمْعٌ وَأَمَّا الْعَيْنُ فَمُقِرَّةٌ مُقِرَّةٌ بِمَا يُوعَى الْقَلْبُ» ’’جہاں تک کانوں کی بات ہے تو وہ قِیف (کُپّی) کی طرح ہیں اور جو آنکھ ہے تو وہ دل میں پیوست کرنے والی ہے ان چیزوں کو جنھیں دل یاد رکھتا ہے‘‘ :قیف کے ذریعے بوتل وغیرہ میں مائع چیزیں ڈالی جاتی ہیں۔ کان کو قیف سے اس لیے تشبیہ دی گئی کہ یہ علم کی باتوں کو دل و دماغ تک پہنچانے کا ذریعہ ہے اور آنکھ پیوست کرنے والی ہے آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے اسے وہ دل میں ڈالتی رہتی ہے پس دل سمع و بصر کے لیے برتن کی طرح ہے کہ کانوں اور آنکھوں کی پہنچائی ہوئی معلومات و مشاہدات کو خود میں محفوظ رکھتا ہے اور پھر ان معلومات پر غور و فکر کر کے نتائج برآمد کرتا ہے۔

«وَقَدْ أَفْلَحَ مَنْ جَعَلَ قَلْبَهُ وَاعِيًا» ”تحقیق کامیاب ہوا وہ شخص جس نے اپنے دل کو یاد رکھنے والا بنایا“ اگر ایک تین پرزوں کی مشین ہو تو اس کی کارگردگی کا انحصار اس پر ہے کہ تینوں پرزے درست کام کرتے ہوں۔ تو اگر سمع و بصر تو قلب تک اپنی معلومات پہنچائیں لیکن دل مردہ ہو اور وہ ان معلومات کو محفوظ رکھ کر ان پر غور و فکر اور تفکر و اعتبار نہ کرے تو ہدایت، اخلاص اور علم حقیقی کا یہ لائحہ عمل پایہ تکمیل تک نہ پہنچ پائے گا۔ لہذا انسان کا دل بھی ایسا ہی ہونا چاہیے جو غور و فکر کرنے والا ہو اور ایسا ایک صحت مند دل ہی کر سکتا ہے۔ قلب کی صحت سے مراد ہے کہ وہ شہوات اور حبِ دنیا سے محفوظ ہو۔ حدیث کا آخری جملہ پہلے جملے سے ملتا جلتا ہے جہاں فرمایا گیا تھا: «قَدْ أَفْلَحَ مَنْ أَخْلَصَ اللهُ قَلْبَهُ لِلْإِيمَانِ» ”یقینی طور پر فلاح پا گیا وہ جس نے اپنے دل کو ایمان کے لیے خالص کیا“۔ حدیث کا ابتدائی جملہ کامیابی کی وجہ بتاتا ہے جو ایمانِ حقیقی ہے اور آخری جملہ اس وجہ کامیابی کے لائحہ عمل کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ دونوں جملوں میں تعلق یہ ہے کہ سچا اور پختہ ایمان اسی کو حاصل ہو گا جس کا دل یاد رکھنے والا ہو مطلب یہ کہ اس کا دل غافل نہ ہو اور اپنے آلات یعنی سمع و بصر کی معلومات کو اپنے اندر جمع کرے اور تفکر و اعتبار سے ایمان کی تکمیل کرے اور خود کو ایمان کے لیے خالص کر دے۔

*****

شہیدِ اسلام حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی شہید رحمۃ اللہ علیہ (۱۹۳۲ء-۲۰۰۰ء)

تفسیرِ قرآن کے آداب (۲)

سوم

مفسر کے لیے یہ بھی لازم ہے کہ تفسیر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے انوار سے روشنی حاصل کرے اور کسی آیت کی ایسی تفسیر نہ کرے جو حضراتِ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی تفسیر کے خلاف ہو، کیونکہ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین مدرسۂ نبوت کے بلاواسطہ شاگرد ہیں اور حق تعالیٰ شانہٗ کی جانب سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایسے معلمِ انسانیت کو ان کا معلم و مرشد اور ہادی بنایا گیا، جیسا کہ متعدّد مقامات پر فرمایا ہے: ﴿وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ﴾ ظاہر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمِ کتاب و حکمت کے بعد قرآن فہمی میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا ہمسر کون ہو سکتا ہے؟ پھر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نزولِ وحی اور اس کی عملی تشکیل کے عینی شاہد ہیں، امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے الاتقان میں امیر المؤمنین حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کا ارشاد نقل کیا ہے: واللّٰه مانزَلَتْ آيةٌ إلا وقد علمتُ فيمَ أُنزِلت وأين أنزلت، إن ربي وهب لي قلبا عقولا ولسانا سئولا۔ (الاتقان، نوع:۸) ”اللہ کی قسم! جو آیت بھی نازل ہوئی اس کے بارے میں مجھے معلوم ہے کہ کس بارے میں نازل ہوئی اور کہاں نازل ہوئی؟ میرے رب نے مجھے بہت سمجھنے والا دل اور بہت پوچھنے والی زبان عطا فرمائی ہے“۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ نے برسرِ منبر فرمایا: سلوني، فواللّٰه لاتسألون عن شيء إلا أخبرتكم وسلوني عن كتاب اللّٰه، فواللّٰه ما من آية إلا وأنا أعلم أَ بِليلٍ نَزَلَتْ أم بنهار، أم في سهل أم في جبل (حوالۂ بالا) ”مجھ سے سوال کرو، پس اللہ کی قسم! مجھ سے جو بات بھی پوچھو گے

اس کا جواب دوں گا اور مجھ سے کتاب اللہ کے بارے میں پوچھو، پس اللہ کی قسم! قرآن کریم کی کوئی آیت ایسی نہیں جس کے بارے میں مجھے یہ علم نہ ہو کہ وہ رات کے وقت اتری تھی یا دن کے وقت، میدان میں اتری تھی یا پہاڑ پر"۔ اسی طرح فقیہ الامت حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا ارشاد نقل کیا ہے: والذي لاإلٰه غيرهٗ مانزلت آية من كتاب اللّٰه إلا وقد علمت فيمن نزلت وأين نزلت ولو أعلم مكان أحد أعلم بكتاب اللّٰه مني تناله المطايا لأتيتهٗ (حوالہ بالا) "اس ذات کی قسم! جس کے سوا کوئی معبود نہیں، کتاب اللہ کی جو آیت بھی نازل ہوئی اس کے بارے میں مجھے معلوم ہے کہ کس کے حق میں نازل ہوئی؟ اور کہاں نازل ہوئی؟ اور اگر مجھے معلوم ہو کہ کوئی شخص کتاب اللہ کا مجھ سے زیادہ علم رکھتا ہے اور اس تک پہنچنا ممکن ہو تو میں ضرور اس کی خدمت میں حاضر ہوتا"۔ پھر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے ایسی محنت و جانفشانی سے فہمِ قرآن میں مہارت حاصل کی تھی کہ کوئی دوسرا شخص اس کا تصوّر بھی نہیں کرسکتا، اس سلسلے میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے بہت سے عجیب و غریب واقعات نقل کیے گئے ہیں، ان تمام واقعات کو نقل کرنا موجبِ طوالت ہوگا، یہاں حضرت ابوعبدالرحمن اسلمی رضی اللہ عنہ کا صرف ایک فقرہ نقل کردینا کافی ہوگا، وہ فرماتے ہیں: حدثنا الذين كانوا يقرءون القرآن، كعثمان بن عفان رضي الله عنه وعبداللّٰه بن مسعود رضي الله عنه وغيرهما أنهم كانوا إذ تعلموا عن النبيﷺعشر آيات لم يتجاوزوها حتّٰى يعلموا ما فيها من العلم والعمل، قالوا: فتعلمنا القرآن والعلم جميعا ولهٰذا كانوا يبقسون مدة في حفظ السورة (الاتقان، نوع:۷۸) "جو حضرات ہمیں قرآن پڑھاتے تھے جیسے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور دیگر حضرات رضوان اللہ علیہم اجمعین، انھوں نے ہمیں بتایا کہ وہ جب آنحضرت ﷺ سے دس آیتیں سیکھ لیتے تھے تو آگے نہیں پڑھتے تھے، یہاں تک کہ ان آیات میں جو کچھ علم و عمل ہے اس کا علم حاصل نہ کرلیں، وہ فرماتے تھے کہ ہم نے قرآنِ کریم، علم اور عمل تینوں کو اکٹھے سیکھا تھا، اسی بنا پر وہ مدت تک ایک سورت کے حفظ میں مشغول رہتے تھے"۔ الغرض تفسیرِ نبوی کے بعد صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی تفسیر سب سے مقدم ہے اور حقیقت میں وہ بھی آنحضرت ﷺ ہی کی تعلیم کا ثمرہ ہے، اس لیے ایک مفسر کے لیے اس کا نظر انداز کرنا کسی طرح ممکن نہیں اور اسی ضمن میں اکابر تابعین رحمۃ اللہ

علیہم کی تفسیر آتی ہے جنھوں نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے قرآنِ کریم کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی تھی، اس لیے مفسر پر لازم ہے کہ وہ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین و تابعین رحمۃ اللہ علیہم کی تفسیر کے خلاف نہ چلے۔

چہارم

مفسر کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اہلِ حق کے عقائد واعمال اور اخلاق کا پابند ہو، "الإتقان" میں امام ابوطالب طبری رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے: إن من شرطه صحة الاعتقاد أولا ولزوم سنة الدين، فإن من كان مغموصًا عليه في دينه لا يؤتمن علىٰ الدنيا فكيف علىٰ الدين، ثم لا يؤتمن في الدين علىٰ الأخبار عن عالم فكيف يؤتمن فى الأخبار عن أسرار الله تعالىٰ ولأنهٗ لا يؤمن إن كان متهما بالإلحاد أن يبغي الفتنة ويغر الناس بليّه وخداعه (الاتقان، نوع:۷۸) "مفسر کی شرائط میں سے ایک یہ بھی ہے کہ پہلے تو اس کا عقیدہ صحیح ہو، دوسرے وہ سنتِ دین کا پابند ہو، کیونکہ جو شخص دین میں مخدوش ہو کسی دنیوی معاملے میں بھی اس پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا تو دین کے معاملے میں اس پر کیا اعتماد کیا جائے گا؟ پھر ایسا شخص اگر کسی عالم سے دین کے بارے میں کوئی بات نقل کرے اس میں بھی وہ لائقِ اعتماد نہیں، اسرارِ الٰہی کی خبر دینے میں تو کیا لائقِ اعتماد ہوگا۔ نیز ایسے شخص پر اگر الحاد کی تہمت ہو تو اس کے بارے میں یہ اندیشہ ہے کہ وہ تفسیر لکھ کر کوئی فتنہ نہ کھڑا کردے اور لوگوں کو اپنی چرب زبانی و مکّاری سے گمراہ کرے"۔

پنجم

اسی طرح ہر قسم کی بدعت و کج روی سے مفسر کے ذہن کا پاک ہونا بھی ضروری ہے، ورنہ اس کی تفسیر ناقابلِ اعتماد ہوگی، کیونکہ وہ قرآنِ کریم کو اپنی بدعت کے رنگ میں ڈھالنا شروع کردے گا، نام تو ہوگا تفسیرِ قرآن کا، لیکن جو کچھ وہ لکھے گا وہ قرآنِ کریم کی تفسیر نہیں ہوگی، بلکہ اس کے بدعت آلود ذہن کا بخار ہوگا، اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں پر فہمِ قرآن کو حرام کردیا ہے جو بدعت و خواہشِ نفسانی کا چشمہ لگاکر قرآنِ کریم کا مطالعہ کرتے ہیں۔ "الاتقان" میں امام زرکشی رحمۃ اللہ علیہ کی

"البرہان" سے نقل کیا گیا ہے: اعلم أنه لا یحصل للناظر فهم معاني الوحی ولا یظهر لهٗ أسرارهٗ وفي قلبه بدعة أو كبر أو هوىً أو حب الدنيا أو هو مصرّ علیٰ ذنب أو غیر متحقق بالإيمان أو ضعيف التحقيق أو يعتمد علیٰ قول مفسر ليس عندهٗ علم أو راجع إلیٰ معقوله وهٰذه كلها حجب وموانع بعضها آكد من بعض"۔ (الاتقان، ج:۲، نوع:۸۷، ص:۸۱) "جاننا چاہیے کہ قرآنِ کریم کا مطالعہ کرنے والے پر وحی کے معانی ظاہر نہیں ہوتے اور اس پر وحی کے اسرار نہیں کھلتے، جبکہ اس کے دل میں بدعت ہو یا تکبر ہو یا اپنی ذاتی خواہش ہو یا دنیا کی محبت ہو یا وہ گناہ پر اصرار کرنے والا ہو یا اس کا ایمان پختہ نہ ہو یا اس میں تحقیق کا مادہ کمزور ہو، یا وہ کسی ایسے مفسر کے قول پر اعتماد کرے جو علم سے کورا ہو، یا وہ قرآنِ کریم کی تفسیر میں محض عقل کے گھوڑے دوڑاتا ہو، یہ تمام چیزیں فہمِ قرآن سے حجاب اور مانع ہیں، ان میں بعض دوسری بعض سے زیادہ قوی ہیں"۔

ششم: تفسیر بالرائے

جس طرح مفسر کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے خیالات وافکار سے خالی الذہن ہو کر یہ سمجھنے کی کوشش کرے کہ اس آیت میں قرآنِ کریم کی دعوت کیا ہے، اور کن کن مسائل پر روشنی ڈالی جارہی ہے، خود اپنے خیالات وافکار قرآنِ کریم میں ٹھونسنے کی کوشش نہ کرے، اسی طرح اس کا یہ بھی فرض ہے کہ تفسیر بالرائے سے اجتناب کرے، کیونکہ تفسیر بالرائے حرام ہے اور اس پر سخت وعید آئی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے: من قال في القرآن برأيه فليتبوأ مقعدهٗ من النار وفي رواية: من قال في القرآن بغير علم فليتبوأ مقعده من النار (رواہ الترمذی، مشکوٰۃ، ص:۳۵) "جس شخص نے قرآن میں اپنی رائے سے کوئی بات کہی وہ اپنا ٹھکانا دوزخ میں بنائے اور ایک روایت میں ہے کہ جس شخص نے بغیر علم کے قرآن میں کوئی بات کہی وہ اپنا ٹھکانا دوزخ میں بنائے"۔ ایک اور حدیث میں ہے: من قال في القرآن برأيهٖ فأصاب فقد أخطأ (رواہ الترمذی وابوداؤد) "جس شخص نے قرآن میں اپنی رائے سے کوئی بات کہی اس نے اگر ٹھیک کیا تب بھی غلط کیا"۔

تفسیر بالرائے سے کیا مراد ہے؟

امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ ''الاتقان، نوع:۷۸'' میں ابن النقیب رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ تفسیر بالرائے سے کیا مراد ہے؟اس میں اہلِ علم کے پانچ قول ملتے ہیں:

اول: یہ کہ تفسیرِ قرآن کے لیے جن علوم کی ضرورت ہے کوئی شخص ان کو حاصل کیے بغیر تفسیر کرنے بیٹھ جائے۔

دوم: کوئی شخص ان متشابہات کی تفسیر کرنے لگے جن کی مراد اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

سوم: غلط مذہب کو ثابت کرنے کے لیے تفسیر کرنا، یعنی کوئی شخص اپنے مذہبِ فاسد کو تو اصل بنائے اور تفسیر کو اس کے تابع کرے اور جس طرح بھی ممکن ہو کھینچ تان کر قرآنِ کریم کو اپنے مذہب پر چسپاں کرے۔

چہارم: بغیر دلیل کے کسی آیت کے بارے میں یہ دعویٰ کرنا کہ اس سے اللہ تعالیٰ کی قطعی مراد یہ ہے۔

پنجم: محض اپنی خواہش و پسند کے مطابق تفسیر کرنا۔ (الاتقان، جلد دوم، ص:۱۸۳)

تحریفِ معنوی

خلاصہ یہ کہ یہ تمام صورتیں تفسیر بالرائے کے تحت داخل ہیں، ہمارے زمانے میں قادیانی، پرویزی وغیرہ دیگر گمراہ اور کج رو فرقوں کی تفسیروں کا یہی حال ہے، ان کی تفسیر، تفسیر بالرائے سے بڑھ کر قرآن کریم کی کھلی کھلی تحریفِ معنوی ہے، چنانچہ قرآنِ کریم کی آڑ لے کر قطعیاتِ دین کا انکار کیا جاتا ہے، آنحضرت صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمْ کی سنتِ متواترہ کو پسِ پشت ڈالا جاتا ہے، اسلام کے قطعی و اجماعی عقیدے کو جھٹلایا جاتا ہے، چودہ سو سالہ اکابرِ امت کے اجماعِ مسلسل سے (جس کو قرآنِ کریم نے ''سبیل المؤمنین'' فرمایا ہے) انحراف کیا جاتا ہے اور لغت و زبان کے قواعد سے آزاد ہو کر قرآنِ کریم کو جاہلانہ تحریفات کا تختۂ مشق بنایا جاتا ہے، ضروری تھا کہ ایسی تحریفات کی بھی چند مثالیں ذکر کر دی جاتیں، لیکن افسوس کہ اس مختصر مضمون میں اس کی گنجائش نہیں۔

ترجمۂ قرآن کے آداب

قرآنِ کریم کا ترجمہ بھی تفسیر و ترجمانی ہی کی ایک صورت ہے، اس لیے ترجمۂ قرآن میں بھی مندرجہ بالا اصول کا

لحاظ رکھنا اشد ضروری ہے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ قرآنِ کریم کا صحیح ترجمہ کرنا اس کی تفسیر سے بھی مشکل اور نازک کام ہے، اس لیے اس میں حزم واحتیاط کی ضرورت اور بھی زیادہ ہے، ترجمہ کرتے وقت قرآنِ کریم کے الفاظ واسلوب کی رعایت کرنی چاہیے اور یہ ایسی مشکل اور دشوار گزار گھاٹی ہے کہ اچھے اچھے لوگ اس میں لڑکھڑا جاتے ہیں، یہاں مؤرخِ اسلام سید الملۃ والدین علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کا اقتباس نقل کرتا ہوں، جو مولانا قاضی محمد زاہد الحسینی مدظلہٗ نے ”معارف القرآن“ میں ماہنامہ ”العلم“ کراچی کے حوالے سے نقل کیا ہے، سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: ”اس سلسلے میں مجھے دو باتیں کہنی ہیں: ایک تو یہ کہ قرآنِ پاک کے ترجمے میں بے احتیاطی کو کام میں نہ لایا جائے، یہ تحریف ہے، اور جس کی سزا کا حال معلوم ہے، ترجمہ بالکل لفظی کرنا چاہیے، پھر اس کی تشریح اپنے ضروری مطلب کے ساتھ کرسکتے ہیں، یہ کسی طرح درست نہیں کہ ترجمے میں الفاظ کی رعایت کیے بغیر اپنے مطلوب کے مطابق کوشش کی جائے، یہ شدید تحریف ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ پھر کسی دوسری ضرورت کے وقت آپ کو اس آیت کا دوسرا ترجمہ دوسرے ڈھنگ سے کرنا پڑے گا، اس وقت آپ پر یہ ثابت ہوجائے گا کہ ہم نے اتباعِ ہویٰ کا دانستہ ارتکاب کیا۔ دوسری چیز یہ ہے کہ جمہورِ اسلام جس مسئلے پر اعتقادی وعملی طور پر متفق ہوں ان کو چھوڑ کر تحقیق کی نئی راہ اختیار نہ کی جائے، یہ طریق تواتر وتوارث کی بیخ کنی کے مترادف ہے، اس گناہ کا مرتکب کبھی میں خود ہوچکا ہوں اور اس کی اعتقادی وعملی سزا بھگت چکا ہوں، اس لیے دل سے چاہتا ہوں کہ اب میرے عزیزوں اور دوستوں میں سے کوئی اس راہ سے نہ نکلے، تاکہ وہ اس سزا سے محفوظ رہے جو ان سے پہلوں کو مل چکی“۔ (معارف القرآن، ص:۲۶ از مولانا قاضی محمد زاہد الحسینی، بحوالہ ماہنامہ العلم کراچی، جنوری تا مارچ ۱۹۵۹ء)

چند مفید تفاسیر

تفسیر کے موضوع پر ان مختصر اشارات کو ختم کرتے ہوئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ چند مفید اور آسان تفاسیر کی طرف راہنمائی کردی جائے:

ا: معارف القرآن (آٹھ جلدوں میں) از مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ، اس میں قرآنِ کریم کے متن کے ساتھ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کا ترجمہ ہے اور خلاصہ تفسیر حضرت حکیم الامت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی بیان القرآن سے مأخوذ

ہے اور پھر ''معارف و مسائل'' کے عنوان سے ضروری تشریحات و نکات اور مسائل ذکر کیے جاتے ہیں، ہمارے دور کی یہ مفید ترین تفسیر ہے۔

۲: معارف القرآن از مولانا محمد ادریس کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ، محد ثانہ انداز کی یہ بہترین تفسیر ہے، متنِ قرآن کے ساتھ شاہ عبدالقادر محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا ترجمہ ہے، تفسیر میں بیان القرآن کی پیروی کی گئی ہے اور حدیثی، کلامی، فقہی اور تاریخی فوائد کا گراں قدر اضافہ کیا گیا ہے، حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ اس کی تکمیل نہیں فرما سکے تھے، ان کے صاحبزادۂ گرامی حضرت مولانا محمد مالک کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ شیخ الحدیث جامعہ اشرفیہ لاہور نے اس کی تکمیل فرمائی ہے۔

۳: فوائدِ عثمانی بر ترجمہ شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ، حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی قدس سرہٗ نے حضرت شاہ عبدالقادر محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے ترجمے کو جدید قالب میں ڈھالا تھا اور سورۃ البقرہ اور سورۃ النساء کے فوائد بھی تحریر فرمائے تھے، بقیہ فوائد حضرت شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے تحریر فرمائے، یہ تفسیر ایک ادبی شاہکار ہے اور قرآن فہمی کے لیے کلید کا حکم رکھتی ہے۔

۴: تفسیر کشف الرحمٰن از سحبان الہند مولانا احمد سعید دہلوی رحمۃ اللہ علیہ، اس تفسیر میں بھی ترجمہ اور تفسیر کے لیے حضرت شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر موضح القرآن کو بنیاد بنا دیا گیا ہے اور قرآنی مفاہیم کو دہلی کی ٹکسالی زبان میں کیا گیا ہے۔

وأٰخر دعوانا أن الحمد للّٰه رب العالمين

* * * * *

صوفی جمیل الرحمن عباسی
مدیر ماہنامہ مفاہیم و ناظمِ شعبہ تحقیق و تصنیف، فقہ اکیڈمی

بیت المقدس کا تاریخی خاکہ (۱۴)

۵۸۹ ہجری میں سلطان الملک الناصر صلاح الدین یوسف بن ایوب بن شاذی کے انتقال کے بعد سلطنتِ ایوبیہ ان کے جانشینوں میں تقسیم ہوگئی۔ مصر ان کے بیٹے الملک العزیز عماد الدین کے حصے میں آیا جبکہ دمشق اور اس کے مضافات ان کے بیٹے الملک الافضل نور الدین علی، کرک صلاح الدین ایوبی کے بھائی الملک العادل کے حصے میں آیا جب کہ حلب الملک الظاہر غازی غیاث الدین بن صلاح الدین کے ہاتھ آیا۔ والی مصر الملک العزیز دمشق کی طرف روانہ ہوئے تاکہ یہ شہر الملک الافضل سے چھین لیں۔ اس موقعے پر صلاح الدین ایوبی کے بھائی الملک العادل والئ کرک نے ان دونوں کے درمیان صلح کرا دی اور علاقے از سرِ نو تقسیم کیے گئے۔ ۵۹۱ ہجری میں بھی اسی طرح کی کوشش ہوئی۔ اس موقعے پر صلاح الدین ایوبی کے خاص دوست قاضی الفاضل نے ان کے درمیان صلح کرادی۔ لیکن اگلے سال الملک العزیز نے دمشق پر قبضہ کرلیا اور بعد میں یہاں کی حکومت اپنے چچا الملک العادل کے حوالے کردی۔ صلاح الدین ایوبی اور فرنگیوں کے درمیان جو صلح ہوئی تھی اس کی مدت ۵۹۳ ہجری میں ختم ہو رہی تھی۔ القاضی الفاضل کو صورتِ حال کا ادراک تھا۔ انھوں نے الملک العادل کو جو دمشق میں تھے خط لکھا اور فرنگیوں کے خلاف جہاد کی تیاری کی ترغیب دی۔ اس خط کا خاطر خواہ اثر ہوا اور دمشق میں جہاد کی تیاریاں ہونے لگیں۔ صلح کی مدت ختم ہوتے ہی فرنگیوں نے بیت المقدس فتح کرنے کا اعلان کیا اور شاہ المان (جرمنی) کو جنگ میں شرکت کی دعوت دی اور پیش قدمی شروع کردی لیکن الملک العادل نے آگے بڑھ کر عکا کے نزدیک ان کا مقابلہ کیا اور انھیں شکستِ فاش سے دوچار کیا اور آگے بڑھ کر یافا شہر فتح کرلیا۔ البتہ اسی سال فرنگیوں نے بیروت پر قبضہ کرلیا۔ اس سال کئی مقامات پر

مسلمانوں اور فرنگیوں کی جنگیں جاری رہیں۔ ۵۹۴ ہجری میں فرنگیوں نے ایک لشکرِ جرار مسلمانوں کے قلع قمع کے لیے منظم کیا۔ الملک العادل اور ان کے بھتیجے، الملک العزیز اور الملک الافضل کی مشترکہ فوجیں لبنان کی طرف بڑھیں اور توران یا تبنین کے علاقے میں فوجیں آمنے سامنے ہوئیں لیکن لڑائی کی نوبت نہیں آئی اور صلح ہوگئی۔ ۵۹۵ ہجری میں شاہِ مصر الملک العزیز کا انتقال ہوا۔ ان کے دس سالہ بیٹے المنصور تخت پر بیٹھے۔ اکثر امرا کی رائے تھی کہ ایک بچہ مصر کی حکومت نہیں چلا سکتا بلکہ مصر کی حکومت الملک العادل کے حوالے کرنی چاہیے جو ایک نیک دل حاکم اور علمائے کرام وفقہا کی پیروی کرنے والے تھے۔ لیکن کچھ لوگوں نے الملک الافضل کو بلا کر حکومت ان کے حوالے کر دی۔ جنھوں نے المنصور کو تخت نشین رہنے دیا لیکن نظامِ سلطنت اپنے ہاتھ میں رکھا۔ ۵۹۶ ہجری میں الملک الافضل نے مصری فوجوں کے ساتھ دمشق پر حملہ کر کے محاصرہ کر لیا۔ الملک العادل ماردین کے محاصرے میں مشغول تھے۔ وہ دمشق کی طرف روانہ ہوئے۔ اکثر مصری امرا، الملک الافضل کے دل سے حمایتی نہ تھے۔ انھوں نے محاصرے میں عدم دلچسپی کا مظاہرہ کیا اور دوسری طرف مصری فوجیں موسم سرما کی سختیوں سے گھبرا گئیں تھیں۔ چناں چہ الملک العادل کے آنے کی خبر سن کر مصری محاصرہ اٹھا کر چل دیے لیکن مصر کے امرا نے الملک العادل سے درخواست کی کہ تیزی سے سفر کر کے مصر پہنچیں۔ چناں چہ الملک الافضل کے پہنچنے سے پہلے ہی الملک العادل، قاہرہ میں داخل ہوئے جہاں انھیں خوش آمدید کہا گیا۔ اب المنصور اور اس کے حامی امرا نے بھی ان کی بادشاہی قبول کر لی۔ اس طرح پورا مصر امن وامان کے ساتھ الملک العادل کی حکومت میں داخل ہو گیا۔

۶۰۳ ہجری میں طرابلس اور حمص کی طرف فرنگیوں کے حملے بڑھ گئے۔ حمص کے والی اسد الدین شیر کوہ میں ان کا مقابلہ کرنے کی سکت نہ تھی۔ چناں چہ الملک العادل اور والیٔ حلب الملک الظاہر اپنی فوجوں کے ساتھ ان کی مدد کو بڑھے اور عکا شہر کا محاصرہ کیا، یہاں فرنگیوں نے مسلمان قیدیوں کی رہائی کے بدلے صلح کی درخواست کی جو قبول ہوئی، اس کے بعد یہ لشکر طرابلس کی طرف بڑھا اور یہاں کچھ فرنگی دستوں کو شکست دے کر مالِ غنیمت حاصل کیا آخر کار فرنگیوں نے صلح کی درخواست کی جو قبول کر لی گئی۔ ۶۱۳ ہجری میں مسلمانوں اور فرنگیوں کی صلح ختم ہوئی۔ الملک العادل اپنے بیٹے الملک المعظم کے ساتھ مصر سے شام کی طرف نکلے۔ دمشق سے گزرتے ہوئے انھوں نے اہلِ دمشق کو دفاع مضبوط کرنے کا حکم دیا اور

جولان کی طرف جاتے ہوئے مرج الصُفر پہنچ گئے۔ یہاں والیٔ حِمص اسد الدین شیر کوہ بھی ان سے آملے۔ فرنگی جولان کی طرف بڑھے۔ الملک المعظم نے اپنی فوج کو لے کر قدس اور نابلس کے درمیان ڈیرے ڈال دیے تاکہ فرنگی قدس کی طرف پیش قدمی نہ کرسکیں۔ فرنگیوں نے طور قلعے کا محاصرہ کیا لیکن یہاں کے امرانے کامیابی سے دفاع کیا۔ چناں چہ مایوس ہوکر فرنگی عکا کی طرف لوٹ گئے۔ ۶۱۵ ہجری میں شاہِ روم نے حلب کی طرف حملہ کیا، بدقسمتی سے الملک الافضل بن صلاح الدین نے اس کی حمایت کی لیکن الملک الاشرف موسی ابن الملک العادل نے ان کا راستہ روکا اور شکست سے دوچار کیا۔ اسی سال فرنگی دمیاط کی طرف حملہ آور ہوئے تو الملک المعظم بن عادل نے قَیمون کے علاقے میں ان کا مقابلہ کیا۔ اللہ کے فضل سے فرنگیوں کو شکستِ فاش ہوئی۔ بڑی تعداد مقتول ہوئی اور بہت سارے فرنگی قیدی بنائے گئے۔ البتہ فرنگی برج سلسلہ نامی جزیرہ نما پر قبضہ کرنے میں کامیاب رہے جو دفاعی لحاظ سے بہت اہم جگہ تھی۔ الملک العادل اس خبر سے بہت دلبرداشتہ اور غمگین ہوئے اور بیمار پڑ گئے۔ فرنگیوں نے دمیاط کا محاصرہ کرلیا اور دورانِ محاصرہ ہی الملک العادل نے انتقال فرمایا۔ ان کی موت کے موقعے پر ایک غلط خبر کی وجہ سے، مسلمان لشکر کے سالار الملک الکامل محمد بن الملک العادل کو مصر جانا پڑا۔ ان کی غیر موجودگی میں کفار نے سخت حملے کیے۔ بادشاہ کے انتقال اور سالار کی رخصتی سے مسلمانوں کے حوصلے پست ہوگئے تھے، نتیجے میں فرنگیوں کو دمیاط پر غلبہ حاصل ہوا۔ الملک الکامل جب واپس آئے تو دیکھا کہ شہر فتح ہوچکا ہے لہذا وہ محاصرہ کرکے بیٹھ گئے۔ (تاریخ ابنِ کثیر) ''اس دوران خشکی و تری میں بہت سی لڑائیاں ہوئیں۔ یہاں تک کہ عام مسلمان بھی کافروں کی فوج پر حملہ آور ہوجاتے۔ تین سالہ محاصرے کے بعد دونوں فریق تنگ آچکے تھے، صلح کی بات چل پڑی تھی لیکن ایک رات مسلمانوں نے ایسا سخت حملہ کیا کہ عیسائیوں کے چھکے چھوٹ گئے اور انھوں نے یکطرفہ طور پر صلح کی درخواست کردی۔ چنانچہ صلح کا آٹھ سالہ معاہدہ، قیدیوں کی رہائی کی شرط پر طے پایا''۔ (السلوك لمعرفة دول الملوك)

۶۲۵ ہجری میں ایک بڑا فرنگی لشکر صِقلّیہ کی طرف سے حملہ آور ہوا۔ اس نے عکّا اور صور کی طرف ڈیرے ڈالے اور پھر صَیدا شہر مسلمانوں سے چھین لیا۔ قبرص جزیرے کا فرنگی حاکم بھی پیش قدمی کرتا ہوا یہاں پہنچا۔ آس پاس کے مسلمان خوف و دہشت کا شکار تھے۔ الملک الکامل محمد بن عادل مصر سے فوجیں لے کر شام کی طرف گامزن ہوئے اور بیت المقدس میں

داخل ہوئے اور اس کے بعد نابلس پہنچے۔ یہاں کے حاکم اور آپ کے بھتیجے الملک الناصر داؤد بن معظم نے خطرہ محسوس کیا اور تشویش کا اظہار کیا اور اپنے دوسرے چچا الملک الاشرف سے مدد طلب کی جو شام پہنچ آئے اور الملک العادل سے رابطہ کیا۔ الملک العادل نے کہا کہ میں تو صرف بیت المقدس کی حفاظت اور فرنگیوں سے دفاع کی خاطر آیا ہوں۔ اب جبکہ آپ شام آگئے ہیں تو میں واپس ہوتا ہوں آپ ہی دفاعِ قدس کا فریضہ سرانجام دیں۔ لیکن الملک الاشرف نے کہا کہ ہم مل کر دفاع کریں گے۔ چناں چہ دونوں لشکر مل گئے۔ اس اتفاق کو دیکھتے ہوئے کئی دوسرے ایوبی امرا بھی ان کے ساتھ آملے۔ لیکن یہ اتفاق عارضی ثابت ہوا۔ اگلا سال تفرقے اور تحزب کا سال تھا۔ ایوبی حکمران باہم دست و گریبان ہونے لگے۔

الملک الکامل کا صلیبیوں سے اتحاد اور قدس کی حوالگی

الملک الکامل کے مقابلے میں دوسرے بھائیوں نے نہ صرف اتحاد کر لیا بلکہ انھوں نے جلال الدین خوارزم شاہ کو بھی ساتھ ملا لیا۔ جس کی نظریں سلطنت ایوبی پر کافی عرصے سے لگی ہوئی تھیں۔ اس پر الملک الکامل سے بڑی غلطی سرزد ہوئی کہ مسلمان مخالفین کے مقابلے میں انھوں نے شاہِ رومانیہ فریڈرک ثانی سے اس شرط پر اتحاد کر لیا کہ حالات نارمل ہونے کے بعد بیت المقدس فرنگیوں کے حوالے کیا جائے گا۔ چناں چہ ۵۲۶ ہجری، ۱۲۲۹ عیسوی میں ایک معاہدے کے تحت بیت المقدس عیسائیوں کے انتظام میں چلا گیا۔ معاہدے کی اہم شقیں یہ تھیں کہ مسجدِ اقصیٰ کا انتظام مسلمانوں کے پاس رہے گا۔ اور اسلامی شعائر قائم رکھے جائیں گے اور فرنگی شہر میں جنگی قلعے تعمیر نہ کریں گے۔ دس سال کے لیے دونوں فریق جنگ نہ کریں گے اور دونوں فریقین کو بیت المقدس میں آنے جانے کی اجازت ہوگی۔ (واقدساہ، ۳۹۳) افسوس جو مقدس شہر ایوبی نے جہاد و قتال سے حاصل کیا تھا، ان کے جانشینوں نے طشت میں رکھ کر عیسائیوں کو پیش کر دیا۔ جس دن قدس شہر عیسائیوں کے حوالے کیا گیا، وہاں کے مسلمان دھاڑیں مار مار کر روئے، اس کے علاوہ دوسرے علاقے کے مسلمانوں میں بھی اس خبر سے ایک کہرام برپا ہوگیا۔ ہر طرف آہ و فغاں اور الملک الکامل کے لیے ملامت کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ ایوبیوں میں سے الملک الناصر داؤد، جنھیں آگے چل کر بیت المقدس کا عارضی فاتح بننا تھا، اس حرکت پر بہت تنقید کرتے تھے۔ الملک الکامل نے اپنا دفاع کرتے ہوئے کہا کہ مسجد الاقصیٰ اور دیگر متبرک مقامات تو مسلمانوں کے کنٹرول ہی میں ہیں، ہم نے

عیسائیوں کو محض شہر اور ان کے گرجا ہی دیے ہیں اور معاہدے کے تحت عیسائی شہر کی گری ہوئی دیواریں تعمیر نہیں کر سکتے، اس طرح مستقل قبضہ برقرار رکھنا ان کے لیے مشکل ہو گا۔(مفرج الكروب في أخبار بني أيوب) حافظ شمس الدین سبط بن جوزی نے انھی دنوں جامع دمشق میں فضائلِ بیت المقدس بیان کرنے شروع کیے۔ ایوبی حکمرانوں کی چپقلش جاری رہی۔ اسی دوران خوارزم شاہ نے بھی ان کے بعض علاقوں پر حملے کیے۔ بلکہ اگلے کئی سالوں میں ایوبیوں اور خوارزمیوں کی لڑائیاں جاری رہیں اور بعض دفعہ ایوبیوں کو خوارزمیوں کے خلاف صلیبیوں سے بھی اتحاد کرنا پڑا۔

الملک الناصر اور فتح بیت المقدس

۶۳۷ ہجری میں عیسائیوں نے بیت المقدس میں ایک قلعے کی تعمیر شروع کر دی جو معاہدے کی خلاف ورزی تھی۔ اس بار الملک الناصر داؤد بن الملک المعظم بن عادل نے بیت المقدس پر حملہ کیا اور منجنیق نصب کر کے خوب سنگ باری کی۔ عیسائیوں کے زیرِ تعمیر قلعے کو تباہ و برباد کرنے کے ساتھ انھوں نے شہر پر قبضہ بھی کر لیا۔ لیکن چند سال بعد ۶۴۱ ہجری میں الملک الناصر نے الملک الکامل کے معاہدے کی طرز پر ایک معاہدے کی رو سے بیت المقدس پھر صلیبیوں کے حوالے کر دیا۔

بیت المقدس صلیبیوں کے حوالے

ایوبی حکمرانوں کا خلفشار اور باہمی چپقلش جاری تھی۔ مصر پر الملک الصالح نجم الدین ایوب کی حکومت تھی جبکہ دوسری طرف کئی ایوبی حکمران ان کے مخالف تھے۔ ان میں سرِ فہرست ان کے چچا الملک الصالح عماد الدین اسماعیل بن الملک والئ دمشق، ان کے چچازاد الملک الناصر داؤد والئ کَرَک اور والئ حمص الملک المنصور تھے۔ انھوں نے الملک الصالح نجم الدین ایوب کے خلاف فرنگیوں سے اتحاد کر لیا۔ اس اتحاد کا اہم نکتہ یہ تھا کہ قدس، طبریہ اور عسقلان فرنگیوں کے حوالے کیے جائیں گے اور بدلے میں صلیبی اپنے اتحادیوں کے ساتھ مل کر مصر پر حملہ کریں گے اور الملک الصالح نجم الدین ایوب سے ان کی جان چھڑائیں گے۔ اس طرح قدس کی تولیت ایک بار پھر "پر امن" طور پر عیسائیوں کی طرف منتقل ہو گئی۔ صاحب المختصر فی اخبار البشر، الملک المؤید عماد الدین اسماعیل (المتوفی: ۷۳۲ھ) کے بیان کے مطابق اس بار زیارات و

مقدسات بھی صلیبیوں کے حوالے کر دیے گئے۔

الملک الصالح نجم الدین ایوب اور فتح بیت المقدس

اب کی بار صرف ایک سال صلیبیوں کو بیت المقدس پر قابض رہنے کا موقع ملا۔ ۶۴۲ ہجری میں مسلمانوں نے دوبارہ بیت المقدس پر قبضہ کر لیا۔ معاہدے کی دوسری شق ''فتحِ مصر'' کے لیے اتحادی افواج غزہ میں جمع ہونے لگیں تو الملک الصالح نجم الدین ایوب نے خوارزمیوں سے مدد طلب کی۔ سلطنتِ خوارزمی کے زوال کے بعد خوارزمی فوج اِدھر اُدھر کے حاکموں کی جنگی خدمت کر کے ہی گزارا کرتی تھی۔ چناں چہ خوارزمی غزہ پہنچ گئے۔ مصری فوج شام کی طرف روانہ ہوئی۔ آگے چل کر تاتاریوں کو شکست دے کر ''الملک المظفر'' کے لقب سے شہرت پانے والے، الملک الصالح نجم الدین ایوب کے مملوک اور سالار رکن الدین بیبرس بھی مصری لشکر میں شامل تھے۔ ۶۴۲ ہجری میں مصری افواج نے متحدہ لشکر کو شکستِ فاش دی اور تعاقب کر کے ان کی بڑی تعداد کو قتل کیا۔ بیت المقدس، غزہ اور ساحلی علاقوں پر مصر کی حکومت قائم ہو گئی۔ اس طرح بیت المقدس ایک بار پھر طویل مدت کے لیے مسلمانوں کی تولیت میں آ گیا۔

جاری ہے

کتابیات

واقدساہ، دکتور سید حسین العفّانی

البدایہ والنہایہ لابنِ کثیر

المختصر في أخبار البشر السلوك لمعرفة دول الملوك

مفرج الكروب في أخبار بني أيوب

****

مولانا حماد احمد ترک

نائب مدیر، ماہنامہ مفاہیم، کراچی

سفر نامۂ ترکی (۷)

اس وقت ہم فاتح بلدیہ میں واقع آئی ایچ ایچ کے صدر دفتر کے سامنے موجود ہیں۔ آئی ایچ ایچ ایک عالمی فلاحی ادارہ ہے جو ۱۹۹۲ء سے آفات زدہ یا جنگ سے متاثرہ خطوں میں امدادی سرگرمیاں انجام دے رہا ہے۔ آئی ایچ ایچ کا صدر دفتر ترکی میں ہے جبکہ پانچ براعظموں میں رسائی رکھنے والے اس ادارے کے ذیلی دفاتر ۱۲۳ ممالک میں فعال ہیں جہاں بے شمار رضاکار سرگرمِ عمل ہیں۔ اس ادارے کا ہدف مظلوم انسانوں کی مدد اور انھیں بنیادی انسانی حقوق تک رسائی دلانا ہے چاہے مظلوم کسی خطے، کسی ملک اور کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں۔ آئی ایچ ایچ کی امدادی سرگرمیاں صرف غذا اور دوا تک ہی محدود نہیں بلکہ تعلیمی اور ثقافتی نوعیت کی بھی ہیں۔ یہ ادارہ اولاً غذائی اجناس اور رہائش و لباس فراہم کرتا ہے تاکہ فوری نوعیت کے مسائل کا ازالہ کیا جا سکے، پھر بچوں کے لیے تعلیمی اداروں کے قیام اور بڑوں بالخصوص خواتین کے لیے تربیتی اداروں کا ایک منظم سلسلہ جاری کرتا ہے جہاں ایک طرف بچے تعلیم حاصل کر کے ملک و ملت کا سہارا بنیں؛ ایک اچھا انسان اور ایک مثالی مسلمان تیار کرنا ان اداروں کی اولین ترجیح ہوتی ہے، تو دوسری طرف خواتین کو گدائی کے عار سے اور نوجوانوں کو بے روزگاری کے وار سے بچایا جاتا ہے۔ خواتین سلائی و دیگر فنون سیکھ کر باعزت طور پر رزقِ حلال کماتی ہیں اور نوجوان مختلف شعبوں میں مہارت پیدا کر کے اپنے خاندان کا سہارا بنتے ہیں۔ ان تعلیمی اداروں سے پڑھے ہوئے اکثر نوجوان آئی ایچ ایچ کے لیے رضاکارانہ خدمات بھی انجام دیتے ہیں۔ فلاحی سرگرمیاں تو دنیا میں بہت سے ادارے انجام دیتے ہیں لیکن آئی ایچ ایچ کا طرّۂ امتیاز ان کا نظم و ضبط اور اعلیٰ معیار ہے۔ جو معیار ادارے کے ذمے دار افراد اپنے لیے قائم کرتے

ہیں، قریب قریب یتیموں اور بیواؤں کے لیے تعمیر کردہ عمارتیں اور مراکز بھی اسی معیار پر قائم کیے جاتے ہیں جہاں ہر طرح کی سہولت میسر ہوتی ہے۔ ایک اور امتیازی وصف آئی ایچ ایچ کا یہ ہے کہ یہاں مظلوم مسلمانوں کو کسی طور احساسِ کمتری کا شکار نہیں ہونے دیا جاتا۔ امداد کی تقسیم ہو یا ہنر کی تعلیم؛ کسی کی تحقیر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ انتہائی عزت و احترام اور وقار کے ساتھ یہ امور انجام دیے جاتے ہیں۔ آئی ایچ ایچ کے دفتر کے اس مختصر دورے میں مختلف شعبوں کا تعارف کروایا گیا۔ آخر میں وہ کمرہ دکھایا جہاں پانچ نمائندے بیٹھتے ہیں اور پانچ برِاعظموں کا انتظام سنبھالتے ہیں۔ انھی میں سے ایک عاطف صاحب بھی تھے جن کا تعلق آزاد کشمیر سے ہے اور وہ صدر دفتر میں برِصغیر کے امدادی امور کی نگرانی پر مامور ہیں۔

صدر دفتر کا دورہ مکمل ہوا تو پیدل ہی ''اکسرائے'' روانہ ہوئے۔ ''اکسرائے'' بھی استنبول کا مشہور علاقہ ہے جہاں 'ہواش' کا اڈہ ہے۔ 'ہواش' ایک بس سروس ہے جو استنبول کے مختلف علاقوں سے چلتی ہے اور ہوائی اڈے تک جاتی ہے۔ جیسے ہی بس آئی تو بس میں سوار ہوئے اور ہوائی اڈے کی طرف روانہ ہوگئے۔ یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ استنبول میں دستیاب پبلک ٹرانسپورٹ کی مختلف انواع کا بھی ذکر ہو جائے۔ استنبول میں تین طرح کی بسیں اور تین طرح کی ریل گاڑیاں پبلک ٹرانسپورٹ کے لیے چلتی ہیں۔ ایک بس تو یہی 'ہواش' ہے جو مختلف مقامات سے ہوائی اڈے تک جاتی ہے۔ ایک بس وہ ہے جو استنبول کے اندر ایک مقام سے دوسرے مقام تک جاتی ہے اور عام سڑک پر چلتی ہے۔ بس کی تیسری قسم وہ ہے جو کراچی کی گرین لائن اور اسلام آباد یا لاہور کی میٹرو بس جیسی ہے جسے آپ ڈیڑھ بس بھی کہہ سکتے ہیں یعنی ایک اور آدھی بس، کیونکہ یہ عام بسوں سے بڑی ہوتی ہے، نیز یہ عام سڑک کے بجائے متعیّن کردہ سڑک پر چلتی ہے۔ ریل گاڑیوں سے ہماری مراد وہ سواریاں ہیں جو پٹڑی پر چلتی ہیں، ان میں ایک تو ٹرام ہے جو استنبول کے یورپی حصے میں چلتی ہے اور پھر اس ٹرام کا ہی ایک سلسلہ استقلال اسٹریٹ کے لیے مختص ہے۔ دوسری ریل گاڑی مرمرائے کہلاتی ہے جو آبنائے باسفورس میں بنائی گئی سرنگ سے گزرتی ہے یعنی یورپ کو ایشیا سے ملاتی ہے، اور تیسری ریل میٹرو کہلاتی ہے جو استنبول ہی کے مختلف مقامات تک جاتی ہے۔ تینوں کی پٹڑیاں الگ الگ ہیں۔ اور ایک شہر سے دوسرے شہر جانے والی ریل گاڑی ان سے الگ ہے۔ ایک اور اہم اور کثیر الاستعمال ذریعہ کشتی یعنی ferry ہے جو خلیجِ باسفورس کے مختلف حصوں کو باہم ملاتی ہے۔

یہ کشتی دوسرے شہروں تک بھی جاتی ہے۔کچھ علاقوں میں چھوٹی ویگن نما گاڑیاں بھی پبلک ٹرانسپورٹ کے لیے استعمال ہوتی ہیں۔ٹیکسی کا استعمال ان کے علاوہ ہے۔

کہیں کہیں بلدیہ کی جانب سے دوسرے علاقوں میں جانے کے لیے چیئر لفٹ بھی لگائی گئی ہیں۔یہاں چیئر لفٹ کو ”ٹیلی فیرک“ کہتے ہیں۔بس، ٹرام اور ریل میں کرائے کی ادائیگی استنبول کارڈ سے کی جاتی ہے جس کا ذکر گزشتہ اقساط میں آ چکا ہے۔ایک دفعہ کارڈ میں پیسے ڈلوالیں، پھر اسی کارڈ کو ہر جگہ استعمال کر سکتے ہیں۔صرف سفر کے لیے ہی نہیں، تفریح گاہوں اور سیاحتی مقامات پر بھی یہ کارڈ استعمال ہوتا ہے حتی کہ عوامی غسل خانے بھی اس کارڈ کی توانائی سے کھلتے چلے جاتے ہیں۔استنبول کے ان ذرائع کو دیکھ کر یک لخت شہرِ کراچی کا منظر آنکھوں میں گردش کرنے لگتا ہے اور وہاں کی پبلک ٹرانسپورٹ کی دگردوں صورتِ حال پر افسوس ہونے لگتا ہے۔شہرِ کراچی کے باشندے تو روز ہی یہ مناظر دیکھتے ہیں، جو کراچی سے باہر ہیں وہ اس منظر کا نظارہ کرنا چاہیں تو ضمیر جعفری کی نظم ”کراچی کی بس میں سفر ہو رہا ہے“ پڑھ سکتے ہیں۔یہاں کا نظام دیکھ کر یہی خواہش ہوتی ہے کہ کراچی جیسے بڑے شہر کو بھی استنبول کی طرح ٹرانسپورٹ کے جامع نظام کی ضرورت ہے۔ایک اور چیز یہ دیکھنے میں آئی کہ جگہ جگہ کہیں درخت کے ساتھ اور کہیں کسی جنگلے کے ساتھ سائیکلیں بندھی ہوئی تھیں جنھیں اسی کارڈ کے ذریعے سے کھول کر استعمال کیا جاسکتا ہے۔سائیکل کا ٹریک بھی الگ بنا ہوا ہے۔جہاں ضرورت پوری ہوئی، وہیں سائیکل کو قریبی متعیّن جگہ چھوڑ دیا۔سائیکل کے علاوہ بعض جگہ اسکوٹی بھی نظر آئی۔اسکوٹی سے ہماری مراد لیڈیز اسکوٹر نہیں بلکہ سائیکل سے مشابہ ایک چھوٹی سواری ہے جس میں دو پہیوں کے درمیان ایک تختہ لگا ہوتا ہے، ایک پاؤں تختے پر ہوتا ہے اور دوسرے کو زمین پر مار کر آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔یہ بات بھی سننے میں آئی کہ بلدیہ نے تدریجاً؛ پارکنگ کی فیس میں خاطر خواہ اضافہ کر دیا ہے تاکہ ذاتی گاڑیوں کے استعمال پر پبلک ٹرانسپورٹ کو ترجیح دی جائے۔بہر حال؛ یہ تھا استنبول میں سیاحت کے عوامی ذرائع کا مختصر تعارف۔اب ہم دوبارہ آپ کو ہوائی جہاز میں لے چلتے ہیں جہاں ہم استنبول سے حطائی کا سفر کر رہے ہیں۔

استنبول سے حطائی تک تقریباً دو گھنٹے کا سفر تھا۔حطائی پہنچے تو رات ہو چکی تھی۔حطائی شہر سے قریب ہی ایک مقبرہ ہے

جو حضرت حبیب نجار رحمۃ اللہ علیہ سے منسوب ہے۔ شیخ حبیب نجار وہ نیک ہستی ہیں جن کا ذکر سورۂ یٰس کی ان آیات میں ہے: وَجَاءَ مِنْ أَقْصَى الْمَدِينَةِ رَجُلٌ يَسْعَىٰ قَالَ يَا قَوْمِ اتَّبِعُوا الْمُرْسَلِينَ ﴿٢٠﴾ اتَّبِعُوا مَن لَّا يَسْأَلُكُمْ أَجْرًا وَهُم مُّهْتَدُونَ ﴿٢١﴾ وَمَا لِيَ لَا أَعْبُدُ الَّذِي فَطَرَنِي وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴿٢٢﴾ أَأَتَّخِذُ مِن دُونِهِ آلِهَةً إِن يُرِدْنِ الرَّحْمَٰنُ بِضُرٍّ لَّا تُغْنِ عَنِّي شَفَاعَتُهُمْ شَيْئًا وَلَا يُنقِذُونِ ﴿٢٣﴾ إِنِّي إِذًا لَّفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ﴿٢٤﴾ إِنِّي آمَنتُ بِرَبِّكُمْ فَاسْمَعُونِ ﴿٢٥﴾ قِيلَ ادْخُلِ الْجَنَّةَ ۖ قَالَ يَا لَيْتَ قَوْمِي يَعْلَمُونَ ﴿٢٦﴾ بِمَا غَفَرَ لِي رَبِّي وَجَعَلَنِي مِنَ الْمُكْرَمِينَ ﴿٢٧﴾ ” اور شہر کے پرلے علاقے سے ایک شخص دوڑتا ہوا آیا۔ اس نے کہا: اے میری قوم کے لوگو! ان رسولوں کا کہنا مان لو۔ ان لوگوں کا کہنا مان لو جو تم سے کوئی اجرت نہیں مانگ رہے، اور وہ صحیح راستے پر ہیں۔ اور بھلا میں اس ذات کی عبادت کیوں نہ کروں جس نے مجھے پیدا کیا ہے؟ اور اسی کی طرف تم سب کو واپس بھیجا جائے گا۔ بھلا کیا اسے چھوڑ کر میں ایسوں کو معبود مانوں کہ اگر خدائے رحمن مجھے کوئی نقصان پہنچانے کا ارادہ کر لے تو ان کی سفارش میرے کسی کام نہ آئے، اور نہ وہ مجھے چھڑا سکیں؟ اگر میں ایسا کروں گا تو یقیناً میں کھلی گمراہی میں مبتلا ہو جاؤں گا۔ میں تو تمھارے پروردگار پر ایمان لا چکا۔ اب تم بھی میری بات سن لو۔ (آخر کار بستی والوں نے اس کو قتل کر دیا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس سے) کہا گیا کہ: جنت میں داخل ہو جاؤ، اس نے (جنت کی نعمتیں دیکھ کر) کہا کہ: کاش! میری قوم کو معلوم ہو جائے، کہ اللہ نے کس طرح میری بخشش کی ہے، اور مجھے باعزت لوگوں میں شامل کیا ہے“۔

انھیں دعوتِ دین کی پاداش میں ان کی قوم نے شہید کر دیا تھا۔ رات کافی ہو گئی تھی اس لیے اس طرف نہ جا سکے۔ رات ہمارا قیام ترکی کے ایک سرحدی شہر ریحانلی میں تھا۔ ہمیں آئی ایچ ایچ کے زیرِ انتظام یتیم بچوں کے ایک وسیع مرکز مدینۃ الأیتام میں ٹھہرایا گیا۔ یہ چار دیواری میں محصور ایک رہائشی کالونی جیسا مرکز تھا جہاں ایک ترتیب پر مکانات بنے ہوئے تھے۔ کھیل کا میدان، وسیع اراضی پر قائم اسکول اور دستکاری کے مراکز بھی نظر آئے۔ ہمیں بھی ان مکانات میں سے ایک میں ٹھہرایا گیا جو یتیم شامی بچوں کے لیے تعمیر کیا گیا تھا۔ بلاشبہ یہ مکان کسی بھی طرح کراچی کی بہترین رہائشی سوسائیٹیوں سے کم نہیں تھا۔ عمدہ طرزِ تعمیر، فرنیچر انتہائی نفیس اور در و دیوار نہایت شاندار اور پھر ضرورت کی ہر چیز، انواع و اقسام کے برتن،

واشنگ مشین وغیرہ۔ الغرض حجم میں چھوٹا ہونے کے باوجود یہ مکان ہر اعتبار سے معیاری تھا۔

نمازِ فجر اور ناشتے کے بعد یہاں سے روانہ ہوئے۔ راستے میں شام کی پہاڑیوں کا طویل سلسلہ ہمیں مسلسل غیروں کے ظلم اور اپنوں کی بے حسی کے قصے سناتا رہا۔ کبھی کبھی سرگوشی میں ان کا شکریہ بھی ادا کرتا تھا جو روزِ اول سے آج تک شام کی ویرانی پر نوحہ کناں اور اس کی رونقوں کی بحالی میں صبح و شام مصروفِ کار ہیں۔ شام وہ ارضِ مقدس ہے جسے سورۂ بنی اسرائیل میں بابرکت قرار دیا گیا اور احادیث میں شام کے ساتھ جڑے رہنے کی تلقین کی گئی۔ تاکید کے ساتھ بتایا گیا کہ جب ہر سمت گمراہی کے اندھیرے ہوں گے تو خیر شام میں ہوگا۔ عیسیٰ علیہ السلام یہاں نزول فرمائیں گے۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے فضائل الصحابہ میں عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا یہ قول نقل کیا کہ: ”بے شک خیر کو دس حصوں میں تقسیم کیا گیا پس نو حصے تو شام میں رکھے گئے اور دسواں اِدھر باقی زمین میں۔ اور شر کے بھی دس حصے کیے گئے، اس کے نو حصے تو باقی زمین میں ہیں اور دسواں حصہ شام میں رکھا گیا ہے“۔

بخاری شریف کی روایت ہے کہ نبیٔ اکرم ﷺ نے شام کے لیے دعا فرمائی۔ آپ ﷺ کے الفاظ ہیں: «اللَّهُمَّ بَارِكْ لَنَا فِي شَأْمِنَا» ”اے اللہ! ہمیں ہمارے شام میں برکت عطا فرما“۔ طبرانی کی روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: «طُوبَى لِلشَّامِ (ثَلَاثَ مَرَّاتٍ)، فَقُلْنَا: لأَيٍّ ذَلِكَ يَا رَسُولَ اللهِ؟ قَالَ لأَنَّ مَلَائِكَةَ الرَّحْمَنِ بَاسِطَةٌ أَجْنِحَتَهَا عَلَيْهَا» ”شام کے لیے بشارت ہو! شام کے لیے بشارت ہے! شام کے لیے خوش خبری ہے!“۔ ہم نے عرض کیا: یارسول اللہ! کس لیے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ”کیونکہ رحمٰن کے فرشتے اس پر اپنے پروں کو پھیلائے رہتے ہیں“۔

اگرچہ شام میں جنگی حالات اور کشیدہ صورتِ حال طویل عرصے سے چلی آرہی تھی لیکن موجودہ بحران کا آغاز ۲۰۱۱ء سے ہوا جب شام کے صدر بشار الاسد نے شامی مسلمانوں کے ایک مظاہرے پر ہیلی کاپٹر سے شیلنگ کروائی۔ اس وحشیانہ رویے کے ردِعمل میں کئی شہروں میں مظاہرین سڑکوں پر نکل آئے۔ بشار کے شیطانی ذہن اور فرعونی غرور نے ان مظاہروں کو بزورِ طاقت فرو کرنے کی کوشش کی لیکن جتنا ظلم بڑھتا رہا اتنا ہی مظاہرین کا جوش وولولہ تقویت پاتا رہا اور ان کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ کچھ ہی عرصے میں مظاہرین کا یہ گروہ باقاعدہ باغی فوج میں تبدیل ہو گیا جس نے بشار کے آگے

سر جھکانے پر شہادت کو ترجیح دی۔ یہاں عالمی شیطانی قوتیں حرکت میں آئیں، ایک طرف بشار کو روس نے تھپکی دی اور جنگ جاری رکھنے کا عندیہ دیا۔ ادھر باغیوں کو مختلف عالمی قوتوں نے اسلحہ فراہم کرنا شروع کیا۔ لوگ مرتے رہے اور شہر کے شہر ویران ہوتے رہے حتیٰ کہ حلب، رقہ، درعا، حمص، دمشق، ادلب وغیرہ جیسے بارونق اور تاریخی شہر کھنڈرات میں تبدیل ہو گئے۔ لاکھوں مسلمان نقل مکانی کر کے ترکی چلے آئے۔ کتنی ہی عورتیں اپنے بچوں اور شوہروں کو بے گور و کفن چھوڑ کر اس دیارِ غیر میں آبسیں اور کتنے ہی بچے والدین سے محروم ہو گئے۔ جو آئے ان میں سے بھی بہت سے معذور اور مجروح تھے۔ دل تو سب کے ہی زخمی تھے، کتنے ہی لوگ دھماکوں اور گولیوں کا نشانہ بن کر ہاتھوں اور پیروں سے محروم ہو چکے تھے۔ یہ سب کچھ تو تاریخ کا حصہ ہے اور ایسا غمگین افسانہ ہے جسے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا، لیکن ایک پہلو اس افسانے کا اور بھی ہے جو یقیناً یاد رکھے جانے اور بار بار دہرائے جانے کے لائق ہے، اور اس پہلو پر روشنی ڈالنے کے لیے ہم ایک سوال کرتے ہیں؟ آج یہ شامی مہاجرین نسبتاً بہتر حال میں ہیں اور انھیں رہائش و آسائش بھی میسر ہے تو یہ سب کیونکر ممکن ہوا؟ کون تھا جس نے انھیں سہارا دیا؟ ۲۰۱۲ میں جب ہم خبروں میں شام پر بمباری کا ذکر پڑھتے اور سنتے تھے اور ان کے ساتھ اظہارِ یکجہتی کے لیے کراچی کی شاہراہوں پر کاغذ کے ٹکڑے لہراتے تھے اور فلک شگاف نعروں اور دھواں دار تقریروں کے بعد مطمئن ہو کر گھروں کو لوٹ آتے تھے، تو کون تھا جو شہدا کی تدفین کرتا تھا، زخمیوں کی تیمار داری کرتا تھا، بچوں کی غذا کا انتظام کرتا تھا، مہاجرین کو مکانات فراہم کرتا تھا، جی ہاں، وہ یہی آئی ایچ ایچ کے بہادر ترک رضا کار تھے جنھیں ترک حکومت کی سرپرستی حاصل تھی۔ انھوں بمباری سے متاثرہ علاقوں میں دھماکوں کی گونج اور گولیوں کے شور میں امدادی سرگرمیاں انجام دیں۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ عالمِ اسلام کے مختلف خطوں سے شامی مسلمانوں کے لیے امداد کا سلسلہ شروع ہو گیا، اور ہمیں آئی ایچ ایچ کے ایک ذمے دار نے بتایا کہ یوں تو امدادی سرگرمیاں؛ عرب و عجم اور ایشیا یورپ افریقہ ہر خطے کی جانب سے ہوتی رہیں لیکن دو ممالک ایسے ہیں جنھوں نے بے تحاشا امداد پہنچائی: ایک پاکستان، اور دوسرا قطر۔ تو یہ ہم پاکستانیوں کے لیے باعثِ فخر بھی ہے اور مقامِ شکر بھی کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کی توفیق سے ایسا ممکن ہوا۔ اور اب بھی اس امداد کا سلسلہ جاری ہے۔ جب بھی ہم امت کے مسائل اور پریشانیوں کا ذکر سنتے ہیں اور مظلوم مسلمانوں کی خبریں بیان کی جاتی ہیں تو ہمیں احمد

فرازؔ کا یہ خوب صورت شعر یاد آجاتا ہے اور ہم اپنے قارئین کو بھی یہی پیغام دینا چاہتے ہیں:

شکوۂ ظلمتِ شب سے تو کہیں بہتر تھا
اپنے حصے کی کوئی شمع جلاتے جاتے

اب ہم آپ کو دوبارہ ریحانلی لے چلتے ہیں جہاں ہم شام کے مقدس پہاڑی سلسلے کا نظارہ کر رہے ہیں۔ ہم انھی پہاڑیوں کے ساتھ چلتے رہے حتیٰ کہ شام کا سرحدی دروازہ آگیا، یہاں سے آگے جانا ممکن نہیں تھا اس لیے دور سے ہی ارضِ مقدس کو سلام کیا اور نمناک آنکھوں اور مغموم دلوں کے ساتھ لوٹ آئے۔

ہماری اگلی منزل آئی ایچ ایچ کا لاجسٹک سینٹر تھا جہاں آج شامی مہاجرین میں امداد تقسیم ہونی تھی۔ اولاً اس سینٹر کا دورہ کیا۔ مختلف مراحل کا جائزہ لیا کہ کس طرح سامان کو محفوظ کیا جاتا ہے۔ کیسے ٹرکوں میں لوڈ ہوتا ہے وغیرہ۔ اس کے بعد اس مقام پر پہنچے جہاں امداد تقسیم ہو رہی تھی۔ ہم نے بھی اس تقسیم میں حصہ لیا۔ امدادی تھیلے؛ غذائی اجناس اور کپڑوں پر مشتمل تھے۔ ہر خاندان کے تھیلے پر اس کا نام لکھا ہوا تھا۔ دراصل یہ تمام مہاجرین اپنے ناموں اور خاندان کے افراد کی تعداد کے ساتھ رجسٹرڈ تھے۔ ہر خاندان کا تھیلا اس کے افراد کی تعداد کے موافق ہوتا تھا۔ ان میں بہت سارے چھوٹے بچے بھی تھے جن سے گفتگو ہوئی اور ان کی دل جوئی کے لیے ہم نے ان کے ساتھ مزاح بھی کیا۔

ایک طرف ترکی کی اس منظم امدادی سرگرمیوں پر خوشی اور اطمینان تھا کہ جن لوگوں کو امین بنا کر پاکستانی مسلمان فراخ دلی سے امداد روانہ کرتے رہے اور دیگر مسلمانوں کو بھی اس طرف راغب کرتے رہے، واقعتاً انھوں نے خدمت کا حق ادا کیا، تو دوسری طرف شامی مسلمانوں کی حالتِ زار اور معصوم یتیم بچوں کی اداس مسکراہٹیں باعثِ رنج والم تھیں۔ وہ پھول جنھیں کِھل کر یہ گلشن مہکانا تھا، وہ ایک مرجھائی ہوئی کلی کی مانند ہم سے اور اپنے بڑوں سے سراپا سوال تھے کہ آخر انھیں کس جرم کی سزا دی گئی؟ ان سے ان کے والدین کیوں الگ کر دیے گئے؟ انھیں تعلیم کے حصول سے کیوں محروم کیا گیا؟ کیا انسانی حقوق کا راگ الاپنے والے انھیں انسان نہیں سمجھتے یا اب تک انھیں اپنی عیاشیوں سے فرصت نہیں کہ ان پر بھی نظر کر سکیں۔ ہم دل ہی دل میں شرمندہ بھی تھے اور خدا سے معافی کے خواستگار بھی، کہ ہم ان شامی بھائیوں کی کما حقہ مدد نہ کر

سکے اوراس کے ساتھ ساتھ احساسِ ندامت بھی غالب تھا کہ خود کو میسر نعمتوں پر خدا کا شکر ادا کرنے سے اب تک محروم رہے۔ یہاں سے فارغ ہوئے تو کچھ دیر آئی ایچ ایچ کے ایک ذمے دار سے گفتگو میں مشغول رہے۔ ان کا کہنا تھا کہ اس وقت سب سے زیادہ ضرورت اسی بات کی ہے کہ ان بچوں کی تعلیم و تربیت کا انتظام کیا جا سکے لیکن ہمارے پاس ایسے رضا کار نہیں ہیں جو تدریس کے شعبے سے وابستہ ہوں۔ آئی ایچ ایچ کے لاجسٹک سینٹر سے نکلے تو شام ہونے والی تھی۔ ہماری اگلی منزل ترکی کا ایک اور سرحدی شہر شان لی عرفہ تھا چنانچہ ایک گاڑی میں شان لی عرفہ کی طرف روانہ ہوئے۔

جاری ہے

*****

فتاویٰ یسئلونک

دارالافتاء، فقہ اکیڈمی

روایت ''حب الوطن من الایمان'' کی تحقیق

سوال: جمعے کے خطبے میں ایک حدیث بیان ہوئی۔ ''حب الوطن من الایمان''۔ اس کا حوالہ مل سکتا ہے؟ دراصل میں نے پڑھا تھا کہ یہ حدیث نہیں کسی کا مقولہ ہے۔ رہنمائی فرمائیے!

جواب: وطن کے اسلامی ہونے اور اس میں اسلامی احکامات پر آسانی سے عمل کی سہولت میسر ہونے کی بنا پر وطن سے محبت کرنا ایمانی جذبہ ہے، کیونکہ یہ محبت درحقیقت اسلام سے ہے، اس محبت کو کوئی غلط نہیں کہتا، ہاں اگر کوئی وطن سے قومیت کی بنا پر محبت کرے اور اس میں کوئی اسلامی پہلو نہ ہو نیز اسلامی احکامات کو پس پشت ڈال کر محض قوم و وطن کے مفاد کو آگے رکھنا چاہے، اس مفاد کی آڑ میں کتنے ہی اسلامی احکام ٹوٹ رہے ہوں اور کتنے ہی لوگوں پر ظلم وستم کا بازار گرم ہو؛ یہ درست نہیں۔ باقی فی نفسہٖ وطن سے محبت جائز ہے۔ احادیث میں اس کا ثبوت ملتا ہے۔ عَنْ أَنَسٍ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ إِذَا قَدِمَ مِنْ سَفَرٍ فَنَظَرَ إِلَى جُدْرَانِ الْمَدِينَةِ أَوْضَعَ رَاحِلَتَهُ وَإِنْ كَانَ عَلَى دَابَّةٍ حَرَّكَهَا مِنْ حُبِّهَا (سنن الترمذي، كتاب الدعوات عن رسول الله ﷺ، باب ما يقول إذا قدم من السفر) ''حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ جب کسی سفر سے لوٹتے تو مدینہ کی دیواروں پر نظر پڑنے پر اپنی اونٹنی کو دوڑاتے اور اگر کسی اور سواری پر ہوتے تو اسے بھی تیز کر دیتے، یہ مدینہ کی محبت کی وجہ سے ہوتا تھا''۔ اس حدیث کی شرح میں محدثین نے فرمایا کہ یہ حدیث مدینہ منورہ کی فضیلت اور وطن کی محبت کی مشروعیت پر دلالت کرتی ہے۔ یہاں یہ بات واضح رہے کہ وطن کی جو محبت جائز ہے وہ ایک فطری محبت ہے۔ اس کو شریعت کی رو سے کوئی خاص اہمیت حاصل نہیں۔ لہٰذا

اسے شرعی طور پر واجب یا فرض یا سنت کہنا درست نہیں۔

باقی رہی بات سوال میں مذکور روایت کی تو اس کے بارے میں تقریبًا تمام محدثین کا اتفاق ہے کہ یہ روایت من گھڑت اور موضوع ہے۔ ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: حَدِيثُ حُبُّ الْوَطَنِ مِنَ الْإِيمَانِ، قَالَ الزَّرْكَشِيُّ: لَمْ أَقِفْ عَلَيْهِ، وَقَالَ السَّيِّدُ مَعِينُ الدِّينِ الصَّفَوِيُّ: لَيْسَ بِثَابِتٍ، وَقِيلَ: إِنَّهُ مِنْ كَلَامِ بَعْضِ السَّلَفِ، قَالَ السَّخَاوِيُّ: لَمْ أَقِفْ عَلَيْهِ(الأسرار المرفوعة في الأخبار الموضوعة، ص١٨٠، الناشر: دار الأمانة مؤسسة الرسالة - بيروت) "حدیث حب الوطن من الایمان؛ زرکشی نے کہا: میں اس پر واقف نہ ہوسکا، سید معین الدین صفوی نے کہا: یہ حدیث ثابت نہیں ہے اور یہ بھی کہا گیا کہ یہ سلف کے کلام کا حصہ ہے (حدیث نہیں ہے) اور سخاوی نے کہا کہ میں اس پر واقف نہیں ہوا"۔ لہذا اس روایت سے وطن کی محبت کو ثابت کرنا یا اس روایت کو بطورِ حدیث پیش کرنا درست نہیں۔

واللہ اعلم بالصواب

۲ محرم الحرام ۱۴۴۰ھ، بمطابق/۱۳، ستمبر ۲۰۱۸ء

فتوی نمبر: ۳۱۶۴

*****

احمد شاہ عرف احمد ندیم قاسمی (۱۹۱۶۔۲۰۰۶)

معروف شاعر، نقاد، افسانہ نگار

پاک سر زمین شاد باد کشورِ حسین شاد باد

تمام اہلِ وطن کو جشنِ آزادی مبارک

خدا کرے کہ میری ارضِ پاک پر اترے

خدا کرے کہ میری ارضِ پاک پر اترے
وہ فصلِ گل، جسے اندیشۂ زوال نہ ہو
یہاں جو پھول کھلے، وہ کھلا رہے صدیوں
یہاں خزاں کو گزرنے کی بھی مجال نہ ہو
یہاں جو سبزہ اُگے، وہ ہمیشہ سبز رہے
اور ایسا سبز، کہ جس کی کوئی مثال نہ ہو
گھنی گھٹائیں یہاں ایسی بارشیں برسائیں
کہ پتھروں سے بھی روئیدگی محال نہ ہو
خدا کرے کہ نہ خَم ہو سرِ وقارِ وطن
اور اس کے حُسن کو تشویشِ ماہ و سال نہ ہو
ہر ایک فرد ہو تہذیب و فن کا اوجِ کمال
کوئی ملول نہ ہو، کوئی خستہ حال نہ ہو
خدا کرے کہ میرے اِک بھی ہم وطن کے لیے
حیات جرم نہ ہو، زندگی وبال نہ ہو

*****

سفرنامہ: مفتی اویس پاشاقرنی

ضبط و ترتیب: مولانا محمد اقبال

افغان نامہ (۱)

سفرِ افغانستان کی مختصر روداد

افغانستان کی مختصر تاریخ: ایک جائزہ

افغانستان کی تاریخ تقریباً پانچ ہزار سال پرانی ہے۔ معلوم تاریخ کے مطابق ۶۰۰ قبل مسیح میں، اس سرزمین پر خانہ بدوش رہتے تھے۔ ۳۳۰ق م تک یہ ملک داریوش سلطنت کا مشرقی صوبہ تھا۔ ۳۲۷ق م میں سکندرِ اعظم نے اس ملک کو اپنا مسکن بنایا تھا اور اس نے تقریباً تین سال تک بلخ؛ جو آج کل افغانستان کا ایک صوبہ ہے؛ کو اپنا دار السلطنت بنایا تھا۔ افغانستان کی تاریخ میں آتا ہے کہ سکندرِ اعظم نے یہاں ''سکندریہ'' کے نام سے کئی شہر آباد کیے تھے۔ سکندرِ اعظم کے بعد ۸۴ء سے ۲۴۱ء تک افغان سرزمین پر کوشانی سلطنت کا دور تھا، جس کا دار الحکومت کاپیسا تھا۔ اس کے بعد جب اسلام کی کرنیں عالمِ عرب سے نمودار ہوئیں تو بہت جلد افغان سرزمین پر اسلام کی روشنی پڑی۔ امیر المؤمنین حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں افغانستان کے اہم حصے مسلمانوں کے زیرِ سایہ آئے اور خلافتِ راشدہ کے بعد یہ ملک خلافتِ بنی امیہ میں بھی اسلامی سلطنت کا حصہ رہا۔ لیکن پھر جب خلافتِ عباسیہ کے عہد میں خلافت کی مرکزیت کمزور ہوئی تو ۹۷۷ء میں اس ملک پر غزنوی خاندان کی سیادت تسلیم کی گئی۔

سب سے پہلے سبکتگین نے حکومت قائم کی اور ان کے بعد ان کے بیٹے سلطان محمود غزنوی بن سبکتگین اس عظیم سلطنت کے فرماں روا بنے۔ محمود غزنوی ۹۷۱ء میں غزنی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد سبکتگین ایک ترک کماندار تھے، انھوں نے ۹۷۷ء میں سلطنت کی بنیاد رکھی تھی۔ سلطان محمود جن کو اسلامی تاریخ کے چند عظیم جرنیلوں اور سلاطین میں ایک

خاص مقام حاصل ہے۔ ان کے بارے میں کہتے ہیں کہ آپ کی فوج میں افغان، غوری، سلجوق، مغل، عرب کے علاوہ دس سے پندرہ ہزار ہندو سپاہی بھی شامل تھے۔ کم و بیش سلطان کی فوج کی تعداد ایک لاکھ تھی۔ عباسی خلیفہ نے ۹۹۹ء میں سلطان محمود کو یمین الدولۃ کا خطاب عطا کیا۔ سلطان محمود غزنوی نے ہندوستان پر سترہ حملے کیے، ان حملوں میں سومنات کی فتح کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ سلطان محمود غزنوی اسلامی تعلیمات کے بڑے پابند تھے اور مسلم حکمرانوں میں قرآن و سنت کی تعلیمات پر سختی سے عمل کرنے والے حکمرانوں میں آپ کا نام آتا ہے۔ غزنوی سلطنت کا دار الحکومت غزنی تھا۔ سلطان محمود غزنوی ۱۰۳۰ء میں انتقال کر گئے۔ ان کے بعد ان کے بیٹے محمد غزنوی ان کے جانشین بنے اور پھر کئی حاکم آئے، آخر کار اس خاندان کی حکومت ۱۱۸۷ء میں ختم ہوئی۔ ہمیں اس سفر میں قندھار سے کابل جاتے ہوئے غزنی میں قیام کا موقع میسر آیا اور سلطان کے مقبرے پر حاضری بھی ہوئی جس کی تفصیل اپنے مقام پر آئے گی ان شاء اللہ۔

۱۱۸۷ء سے ۱۲۲۰ء تک غوری سلطنت نے غزنوی سلطنت کی جگہ لے لی اور غوریوں نے غزنی شہر کو جلا کر تباہ کر دیا۔ سلطان محمود غزنوی کے زمانے میں غوریوں کے امیر محمد بن سوری تھے۔ انھوں نے سلطان محمود غزنوی کے خلاف بغاوت کی، سلطان محمود غزنوی نے ان کی سرکوبی کی اور محمد بن سوری کو گرفتار کر لیا۔ جب وہ انھیں اپنے ساتھ غزنی لے جا رہے تھے تو غزنی پہنچنے سے پہلے راستے میں محمد بن سوری وفات پا گئے۔ سلطان نے ان کے بیٹے ابو علی کو غور کے علاقے کا حاکم بنا دیا، مگر ان کے خلاف ان کے بھتیجے عباس بن محمد بن سوری نے بغاوت کی اور انھیں گرفتار کر کے خود حاکم بن بیٹھے۔ پھر عباس بن محمد بن سوری نے سلطان ابراہیم غزنوی کے خلاف سرکشی کی تو سلطان ابراہیم نے انھیں ہٹا کر ان کے بیٹے محمد بن عباس کو غور کا حاکم مقرر کر دیا۔ محمد بن عباس کے بعد ان کے بیٹے ملک قطب الدین غور کے حکمران بنے اور ان کے بعد عزالدین حسین ان کے جانشین ہوئے۔ عزالدین کے سات بیٹے تھے، انھوں نے اپنی سلطنت کو ان میں تقسیم کر دیا۔ ان میں ایک ملک الجبال محمد قطب الدین بھی تھے جنھوں نے فیروز کوہ کو اپنا دار الحکومت بنا دیا۔ مگر انھی ملک الجبال کا دوسرے بھائیوں کے ساتھ اختلاف ہوا اور ناراض ہو کر غزنی چلے گئے۔ وہاں بہرام شاہ حکمران تھے۔ بہرام شاہ نے بغاوت کے شبہے میں ملک الجبال کو قتل کرا دیا۔ ملک الجبال کے بھائی غور کے حاکم سلطان سیف الدین سوری نے بھائی کے مظلومانہ قتل کا بدلہ لینے کا

فیصلہ کیا اور غزنی پر حملہ کیا تو بہرام غزنوی مقابلہ نہیں کرسکے اور غزنی چھوڑ کر چلے گئے۔ سیف الدین سوری نے اہلِ غزنی سے اچھا سلوک کیا اور اپنا لشکر واپس غور بھیج دیا، لیکن غزنی کے باشندوں نے دوبارہ بہرام غزنوی کے ساتھ خفیہ رابطہ کرکے انھیں واپس بلالیا۔ یہ وہ وقت تھا کہ سلطان سیف الدین سوری نے خود بھی واپسی کا ارادہ کیا تھا، مگر بہرام کے غزنی آنے کی خبر ملتے ہی انھوں نے اہلِ غزنی سے مشاورت کی تو انھوں نے بہرام کے خلاف لڑنے کا مشورہ دیا۔ سلطان کو ان کی خفیہ ساز باز کا پتا نہیں تھا جب وہ ان کے مشورے سے فوج لے کر مقابلے کے لیے نکلے تو پوری فوج بہرام غزنوی سے جاملی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ سیف الدین سوری گرفتار ہوکر دھوکے سے قتل کر دیے گئے۔ اس وقت سلطان سیف الدین کے بھائی علاء الدین فیروز کوہ کا حکمران تھا۔ اس نے بھائیوں کے قتل کا انتقام لینے کے لیے غزنی پر حملہ کیا۔ اس لڑائی میں بہرام غزنوی کو زبردست شکست ہوئی اور علاء الدین نے غزنی شہر کو نذرِ آتش کر دیا، محمود غزنوی کا بسایا ہوا شہر جو عظمت و سطوت کا نشان تھا سات دن جلتا رہا اور یہاں کے باشندوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ میں علاء الدین کو علاء الدین جہاں سوز کے نام سے یاد کیا گیا۔ افغانستان پر غوری خاندان نے ۱۱۸۷ء سے ۱۲۰۶ء تک حکمرانی کی۔

غوری خاندان میں سب سے پہلے حکمران شہاب الدین محمد غوری ہوئے ہیں۔ انھوں نے شمالی ہند میں فتوحات کے جھنڈے گاڑ دیے اور سب سے پہلے ان کے دور میں ہندوستان میں اسلامی حکومت کی بنیاد رکھی گئی۔ انھوں نے ملتان پھر لاہور اور پھر دہلی کو فتح کیا۔ ۱۱۹۱ء میں ان کا مقابلہ دہلی و اجمیر کے ہندو حکمران پرتھوی راج چوہان سے ہوا، اس جنگ میں پرتھوی راج ڈھائی لاکھ فوج کے ساتھ میدان میں اترا جبکہ اس کے مقابلے میں محمد غوری کے پاس فقط تین ہزار مجاہدین تھے۔ اس جنگ میں اس قلیل لشکر نے شکست کھائی۔ محمد غوری نے اس کے ایک سال بعد ایک لاکھ بیس ہزار افراد پر مشتمل فوج میدان میں اتاری اور پرتھوی کے مقابلے میں آئے۔ پرتھوی راج کی فوج کی تعداد تین لاکھ تھی اور اب بھی تین گنا زیادہ تعداد تھی مگر غوری نے اسے شکستِ فاش دے دی۔ پرتھوی کو گرفتار کرکے قتل کر دیا گیا، یہ معرکہ تاریخ میں بہت مشہور ہوا ہے۔ سلطان نے ہندوستان میں مزید فتوحات کا سلسلہ جاری رکھا اور بنارس تک اپنی حکومت کی سرحدیں بڑھائیں۔ ۱۲۰۶ء میں جہلم کے قریب نماز کی حالت میں محمد غوری شہید کر دیے گئے۔ سلطان شہاب الدین غوری کے دور میں حضرت خواجہ

معین الدین چشتی اجمیر تشریف لائے اور اپنی دعوتی کوششوں کا آغاز کیا۔ جب فتنۂ تاتار نے عالمِ اسلام کے مراکز کو تہہ و بالا کر دیا اور تاتاری آندھی بن کر مسلمانوں پر حملہ آور ہوا تو افغانستان بھی اس کا نشانہ بنا اور یہ ملک تقریباً سو سال کے لیے تاتار منگولوں کے قبضے میں آگیا۔ تاتاریوں کے بعد افغانستان کو ۱۳۶۴ء میں تیمور نے فتح کیا۔ ۱۳۶۴ء سے ۱۵۰۶ء تک بابر نے افغانستان میں حکومت کی اور ایک بڑے عرصے تک یہ ملک مغلوں کی سلطنت میں شامل رہا۔ ۱۷۰۹ء میں میرویس نیکہ نے افغانستان میں سلطنت قائم کی اور افغان حکومت کو باہر سے آئے ہوئے حملہ آوروں سے آزاد کرا کر یہاں اصل باشندوں کی حکومت کا راستہ ہموار کیا، جس کی وجہ سے میرویس کا نام آج تک افغانوں میں نہایت احترام سے یاد کیا جاتا ہے۔

۱۷۰۷ء سے ۱۷۴۷ء تک میرویس ہوتک اور ان کے خاندان نے حکومت کی۔ اس کے بعد بابا احمد شاہ ابدالی (افغانستان میں احمد شاہ ابدالی کو بابا کہا جاتا ہے) نے افغانستان کی حکومت سنبھالی جس کے نتیجے میں ایک وسیع ریاست تشکیل دی گئی۔ احمد شاہ ابدالی نے ابتدا میں ایران کے بادشاہ نادر شاہ افشار کی فوج میں ایک نڈر کماندار کی حیثیت سے خدمات انجام دیں اور ۱۷۴۷ء میں نادر شاہ افشار کے قتل کے بعد احمد شاہ ابدالی کو افغانستان کا حکمران منتخب کیا گیا۔ احمد شاہ ابدالی نے بہت جلد منتشر افغان قبائل کو متحد کر دیا اور ایک مستحکم افغانستان کی بنیاد رکھی۔ آپ نے افغانستان کا دار الحکومت قندھار بنا کر یہاں سے اپنی ریاست کی سرحدیں مشرق و جنوب کی سمت میں ہندوستان، مغرب کی طرف سلطنتِ فارس تک بڑھائیں۔ آپ نے خراسان سے کشمیر اور ہندوستان تک غرباً اور شرقاً جبکہ دریائے آمو سے بحیرۂ عرب تک شمالاً جنوباً اپنی سلطنت کو وسیع کیا۔ احمد شاہ ابدالی نے ۱۷۴۸ء سے لے کر ۱۷۶۷ء تک ہندوستان پر سات بار حملہ کیا۔ انھوں نے ۱۷۴۷ء میں درۂ خیبر عبور کیا اور اپنے پہلے حملے میں پشاور کو اپنی سلطنت میں شامل کیا، اور پھر آگے بڑھ کر ہندوستان کے کئی علاقے اپنی سلطنت میں شامل کیے۔ آپ کے ہندوستان پر حملوں میں سب سے بڑا معرکہ پانی پت کی تیسری لڑائی سمجھی جاتی ہے، جس میں انھوں نے ۱۷۶۱ء میں حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کی دعوت پر جنونی مرہٹوں کی بڑھتی ہوئی یلغار کا راستہ روکا۔ یہ وہ وقت تھا جب امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ برصغیر میں مسلمانوں کی علمی و دینی قیادت کر رہے تھے۔ حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ نے محسوس کیا کہ مغل سلطنت ہندو مرہٹوں کی یلغار کے سامنے بے بس ہو چکی ہے تو آپ رحمہ اللہ

نے مرہٹوں کی سرکوبی کے لیے افغانستان کے بادشاہ احمد شاہ ابدالی کو خط لکھا اور ان سے مدد مانگی۔ احمد شاہ ابدالی نے حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کی استدعا پر مرہٹوں کے خلاف جنگ کرنے کے لیے ہندوستان کا رخ کیا۔ حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ نے احمد شاہ ابدالی کے نام خط میں لکھا: ''دریں زمانہ پادشاہے کہ صاحب اقتدار و شوکت باشد و قادر بر شکست لشکر کفار و دور اندیش، جنگ آزما، غیر از ملازمان آں حضرت موجود نیست، لاجرم بر آں حضرت فرض عین است قصد ہندوستان کردن و تسلط کفار مرہٹہ برہم زدن و ضعفاے مسلمین راکہ در دست کفار اسیر اند اخلاص فرمودن، اگر غلبۂ کفر معاذاللہ بر ہمیں مرتبہ ماند، مسلماناں اسلام فراموش کنند، واندکے از زمان نگذرد کہ قومے شوند کہ نہ اسلام را دانند نہ کفر را۔ ایں بلاے عظیم است کہ قدرت بر دفع آں بہ فضل ایزد منان غیر آں حضرت را میسر نیست۔ (شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کے سیاسی مکتوبات، ص: ۵۲، از خلیق احمد نظامی) ترجمہ: اس زمانے میں ایسا بادشاہ جو صاحب اقتدار و شوکت ہو جو مخالفین کے لشکر کو شکست دے سکے اور دور اندیش ہو اور جنگ آزما ہو سوائے آنجناب کے اور کوئی نہیں ہے۔ یقینی طور پر جناب عالی پر فرض عین ہے کہ ہندوستان کا رخ کریں اور مرہٹوں کا تسلط توڑ دیں اور ضعفاے مسلمین کو کافروں کے پنجے سے نجات دلائیں۔ اگر معاذ اللہ دشمنوں کا تسلط اسی طرح جاری رہا تو مسلمان اسلام کو بھول جائیں گے اور تھوڑے زمانے کے بعد مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان تمیز بھی مشکل ہو جائے گی۔ یہ ایک بلاے عظیم ہے، اس بلاے عظیم کے دفع کرنے کی قدرت بہ فضل خداوندی جناب کے سوا کسی کو میسر نہیں''۔

چنانچہ ۱۷۶۱ء میں امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ کی دعوت پر احمد شاہ ابدالی ہندوستان کے مسلمانوں اور یہاں زوال پذیر مغل سلطنت کی حفاظت کے لیے ہندوستان آئے اور پانی پت کے میدان میں پانچ لاکھ مرہٹوں کو تاریخی شکست دی۔ اس جنگ کی ایک یادگار وہ زمزمہ توپ ہے جو آج کل لاہور کے استنبول چوک میں نصب ہے، یہ توپ احمد شاہ ابدالی کے حکم سے مشہور سپہ سالار اور وزیرِاعظم شاہ ولی خان نے شاہ نظیر سے ۱۷۵۷ء میں تیار کروائی تھی۔ یہ ان توپوں میں سے ایک ہے جو احمد شاہ ابدالی نے پانی پت کے میدان میں مرہٹوں کے خلاف ۱۷۶۱ء کی جنگ میں استعمال کی۔ فتح کے بعد سلطان نے واپسی کے وقت زمزمہ توپ لاہور لا کر افغان گورنر خواجہ عبد خان کے سپرد کر دی تھی۔ مرہٹوں کی

اس اندوہناک شکست نے برصغیر کی تاریخ کا دھارا بدل دیا۔ ۱۷۷۲ء میں یہ عظیم بادشاہ قندھار میں وفات پاگئے اور وہیں دفن کیے گئے۔ (ہمیں بھی احمد شاہ بابا کے مزار پر حاضری کا موقع ملا جس کی تفصیل آئندہ اقساط میں بیان کی جائے گی، ان شاء اللہ)۔ ان کے بعد ان کے بیٹے تیمور شاہ ان کے جانشین منتخب کیے گئے۔ ۲۲ سال حکومت کے بعد تیمور شاہ ۱۷۹۳ء میں وفات پاگئے اور ان کے بیٹے شاہ زمان تختِ کابل کے وارث ہوئے۔ تیمور شاہ نے وفات سے پہلے سلطنت بیٹوں میں انتظامی لحاظ سے تقسیم کی، جس سے بھائیوں کے درمیان اقتدار کی جنگ شروع ہوئی۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی اپنی جڑیں مضبوط کر رہی تھی اور مغل سلطنت دن بہ دن کمزور ہو رہی تھی۔ ایسے میں قدرتی طور پر اور سابقہ تاریخ کے تناظر میں مغل سلطنت کی حفاظت کی امید صرف افغانستان سے ہی کی جاسکتی تھی، چونکہ احمد شاہ بابا کے جانشین تیمور شاہ نے بھی ماضی میں ہندوستان کی آزادی کے لیے اپنے عزائم کا اظہار کیا تھا مگر ایران کی سرحد پر ممکنہ خطرات کے پیشِ نظر ہندوستان کے مسلمانوں کی مدد نہ کر سکے، اس لیے انگریز افغانستان سے ہرگز غافل نہیں تھا۔ اسی زمانے میں شاہ زمان کے خلاف قندھار میں احتجاج شروع ہوا، اس کی بنیادی وجہ اگرچہ بھائیوں کے درمیان اقتدار کی کشمکش تھی مگر ساتھ مؤرخین اس کے تانے بانے ایسٹ انڈیا کمپنی سے بھی ملاتے ہیں، کیونکہ انگریز کو ہندوستان پر قبضہ کرنے کے لیے غیر مستحکم افغانستان کی ضرورت تھی۔ ۱۸۰۱ء میں آپس کی لڑائیوں اور بیرونی سازشوں کی بنا پر زمان شاہ کو تخت سے الگ کر دیا گیا اور شاہ محمود تخت نشین ہوئے۔ شاہ محمود تیمور شاہ کے بیٹے تھے، انھوں نے ایرانیوں کے تعاون سے اپنے بھائی شاہ زمان کے خلاف سازش کی اور انھیں اندھا کر کے قید کر دیا اور پھر ۱۸۰۱ء میں تخت پر قابض ہوئے۔ ان کی حکومت کے دو ادوار رہے ہیں، پہلا دور ۱۸۰۳ء تک رہا۔ اس کے بعد ان کا بھائی شاہ شجاع ۱۸۰۳ء سے ۱۸۰۹ء تک رہا۔ پھر دوبارہ شاہ محمود ۱۸۰۹ء میں دوسری بار بادشاہ منتخب ہوئے اور ۱۸۱۸ء میں انھیں اقتدار سے الگ کیا گیا۔ شاہ محمود کے بعد ان کے بھائی علی شاہ ۱۸۱۸ء سے ۱۸۱۹ء تک افغانستان کے حکمران بنے اور بہت جلد ان کے بھائی ایوب شاہ نے انھیں معزول کر کے خود تخت پر قبضہ کیا۔ ایوب شاہ ۱۸۱۹ء میں تختِ افغانستان کے وارث ہوئے اور انھوں نے ۱۸۲۳ء تک افغانستان میں حکومت کی مگر انھیں قتل کر دیا گیا۔ اس کے بعد احمد شاہ کا قبیلہ سدوزئی اور خاندان تخت و تاج

سے محروم ہوا اور محمد زئی قبیلے کی طرف افغانستان کا اقتدار منتقل ہوا جو ایک لمبے عرصے تک اس کے پاس رہا۔ محمد زئی قبیلے کو شروع سے احمد شاہی سلطنت میں وزارت کا منصب ملا تھا، چونکہ تیمور شاہ کے صاحبزادوں اور پوتوں میں اقتدار کی لڑائی ہوئی جس کی وجہ سے اس قبیلے کے سرداروں کو مختلف بھائیوں سے وفاداری کی سزا ملی اور بالآخر احمد شاہ کے خاندان کے تنزل کے نتیجے میں یہ قبیلہ تختِ کابل کا وارث ہوا۔

محمد زئی قبیلے سے تعلق رکھنے والے امیر دوست محمد خان، محمد شاہ درانی کی برطرفی کے بعد ۱۸۲۶ء میں افغانستان کے فرمان روا بن گئے۔ انھوں نے ۱۸۳۵ء میں باقاعدہ امیر المؤمنین کا لقب اختیار کیا۔ ۱۸۳۵ء تا ۱۸۶۳ء تک افغانستان پر امیر دوست محمد خان کی فرمان روائی رہی اور ان کے دور میں پہلی افغان اینگلو جنگ (۱۸۳۹ء۔ ۱۸۴۲ء) ہوئی۔ امیر دوست محمد خان نے دیکھا کہ انگریز بے پناہ مادی وسائل کے ساتھ ہندوستان پر قابض ہو چکا ہے، یہ کسی بھی وقت افغانستان کے لیے خطرہ بن سکتا ہے۔ اور اسی طرح شاہ شجاع سکھوں کے ساتھ مل کر سازش میں مصروف ہے، جبکہ سکھوں نے پشاور پر قبضہ کیا ہے جو سید احمد شہید رحمہ اللہ کی تحریک کے باوجود آزاد نہیں ہو سکا، تو انھوں نے روس کے ساتھ تعلقات استوار کرنے کا فیصلہ کیا۔ مگر انگریزوں کو یہ فیصلہ پسند نہ آیا اور کابل پر حملہ کیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ۱۸۳۹ء میں انگریزوں کی طرف سے افغانستان پر چڑھائی کی گئی اور کئی سال تک افغانستان پر جنگ مسلط رہی اور کابل پر قبضہ کر لیا گیا۔ اس جنگ میں انگریزوں نے امیر دوست محمد خان کو گرفتار کر لیا مگر افغان بہادری اور جوانمردی کے ساتھ جم کر انگریز فوج کے خلاف لڑے۔ سوائے ایک سپاہی کے، جسے عبرت کے لیے زندہ چھوڑا گیا، باقی سولہ ہزار برطانوی فوجیوں کو قتل کر دیا گیا۔ یوں ۱۸۴۲ء کی اس پہلی اینگلو افغان لڑائی میں انگریزوں کو عبرت ناک شکست ہوئی۔ اس کے بعد امیر شیر علی خان کی حکومت ۱۸۶۳ء سے ۱۸۷۹ء تک رہی۔ امیر شیر علی اور امیر یعقوب کے زمانے میں افغان اینگلو دوسری جنگ (۱۸۷۸ء تا ۱۸۸۰ء) ہوئی یہ جنگ اس لیے لڑی گئی کہ امیر شیر علی خان نے برٹش سفارت کاروں کو کابل میں رہائش کی اجازت دینے سے انکار کر دیا، جس پر انگریز نے افغانستان پر حملہ کر دیا۔ امیر شیر علی خان کی حکومت کے بعد ان کے بیٹے امیر محمد یعقوب خان نے حکومت سنبھالی۔ انھوں نے ۱۸۷۹ء تا ۱۸۸۷ء تک یہ منصب اپنے پاس رکھا۔ وہ اپنے والد کی طرح جہاندیدہ نہیں تھے، اس لیے شروع ہی سے

انگریز کی سازشوں کا شکار ہوئے۔

افغان اینگلو دوسری جنگ (۱۸۷۸ء تا ۱۸۸۰ء) کے بعد انگریزوں کے حمایت یافتہ امیر عبدالرحمن جو امیر یعقوب خان کے چچازاد تھے، انھوں نے کابل پر قبضہ کر لیا۔ ان کے والد سردار افضل خان سردار دوست محمد کے بڑے بیٹے تھے مگر سردار دوست محمد خان کی وفات کے بعد سردار دوست محمد خان کے منصب پر ان کے بیٹے سردار شیر علی خان جو سردار محمد افضل سے عمر میں چھوٹے تھے نے اقتدار سنبھالا۔ سردار شیر علی خان کے بعد ان کے بیٹے یعقوب خان اقتدار کے وارث ہوئے، مگر وہ بہت کمزور ثابت ہوئے، اس لیے امیر عبدالرحمن خان نے حکومت پر قبضہ کیا۔ انھوں نے ۱۸۸۰ء سے ۱۹۰۱ء تک افغانستان میں حکومت کی۔ انگریزوں نے امیر عبدالرحمن کے دورِ حکومت میں افغانستان کو بطور ایک آزاد ریاست تسلیم کر لیا۔ امیر عبدالرحمن کے بعد اس کے بیٹے امیر حبیب اللہ خان افغانستان کے حکمران منتخب ہوئے۔ ۱۹۰۱ء سے ۱۹۱۹ء تک امیر حبیب اللہ خان کی حکومت رہی۔ چونکہ امیر حبیب اللہ خان کے ساتھ انگریزوں کے اچھے تعلقات تھے، اس لیے ان کے دور میں افغانستان میں انگریزوں کے اثر و رسوخ میں اضافہ ہوا جس کی وجہ سے عوام کے دلوں میں امیر حبیب اللہ خان کی نفرت پیدا ہو گئی، سبب یہ ہے کہ افغان قوم ہمیشہ سے غیور اور جرات مند رہی ہے اور غیر اقوام کی حکومت کو کبھی قبول نہیں کیا اور جبر و استبداد کے علم بردار انگریز حکومت کے پٹھو حکمران ہمیشہ ذلیل و خوار ہوتے رہے۔ اس نفرت کا نتیجہ یہ نکلا کہ انھیں ۱۹۱۹ء میں قتل کر دیا گیا۔ ان کے قتل ہونے کے بعد ان کے بیٹے امیر امان اللہ خان افغانستان کے بادشاہ بن گئے۔ ان کی حکومت ۱۹۲۹ء تک رہی۔ امیر امان اللہ خان کے انگریزوں کے ساتھ تعلقات خراب ہوئے اور ان کے دور میں تیسری اینگلو افغان جنگ ہوئی جس کے نتیجے میں غیور افغانیوں کو فتح اور انگریز کو شکست ہوئی اور افغانستان ایک آزاد ملک کی حیثیت سے تسلیم کیا گیا۔ امیر امان اللہ خان نے عالمی سطح پر افغانستان کو شناخت دینے اور ایک آزاد ریاست کے طور پر متعارف کرانے میں اہم کردار ادا کیا۔ امیر امان اللہ خان جدت پسند تھے اور وہ ترکی کے کمال اتاترک والی اصلاحات افغانستان میں نافذ کرنا چاہتے تھے مگر افغانستان جیسے روایتی اور قبائلی معاشرے میں جدیدیت کو فروغ دینا اور اس کی طرف سفر کرنا آسان نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ حسبِ توقع افغانستان میں اس کا سخت ردِ عمل آیا اور مختلف قبائل نے بغاوت کر دی۔

اور اس بغاوت کے نتیجے میں امان اللہ خان ۱۹۲۹ء میں ملک چھوڑ کر چلے گئے۔ امیر امان اللہ خان کے فرار کے بعد کابل پر بچہ سقّہ نے قبضہ کیا اور لوٹ مار کی ایک بدنما تاریخ رقم کی۔ جب امان اللہ خان جیسے جہاں دیدہ فرماں روانے بلاوجہ افغانستان میں افغان روایات اور اسلامی تہذیب کے برعکس اقدامات کیے تو یہاں کے مذہبی رہنما اور ان کے زیر اثر عوام نے اس کی شدید مخالفت کی۔ اس مخالفت کے نتیجے میں کاروبار حکومت کا متاثر ہونا ایک لازمی امر تھا لہذا اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انگریزوں نے یہاں ایک مجرم پیشہ شخص حبیب اللہ جن کو لوگ بچہ سقہ کہتے تھے کی مدد شروع کی تاکہ اس کے ذریعے افغانستان میں اپنے مقاصد حاصل کر سکیں۔ بچہ سقہ کا اصل نام حبیب اللہ تھا۔ افغانستان کے علاقے کلکان کا رہائشی اور نسلی اعتبار سے تاجک تھا۔ اسے بچہ سقہ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اس کا باپ بکریاں چرایا کرتا تھا، جب اس پیشے سے مطلوبہ معاشی فوائد حاصل نہ ہو سکے تو اس نے ''سقہ'' کا پیشہ اختیار کیا یعنی کنوؤں سے پانی بھر کر مشکیزوں میں گھروں کو مہیا کرنے لگا تو سقہ کے نام سے مشہور ہوا۔ لہذا اس کے بیٹے حبیب اللہ کو ''بچہ سقہ'' یعنی (پانی لانے والے کا بیٹا) کہا جانے لگا۔ بچہ سقہ شروع میں شاہی فوج میں بھرتی ہوا مگر ایک جرم کی وجہ سے پانچ ماہ قید کی سزا کاٹی۔ رہائی کے بعد وہ فوج سے بھاگ کر پشاور آیا۔ جب افغانستان کے اندرونی حالات امان اللہ خان کے غیر دانش مندانہ رویوں سے کشیدہ ہوئے تو انگریزوں نے محسوس کیا کہ افغان عوام امان اللہ خان سے دل برداشتہ ہیں۔ ایسے میں افغانستان کے اندر مداخلت کا جواز مل گیا، لہذا اس کا ایسا متبادل حکمران ہونا چاہیے جو ہمارے زیر اثر ہو، تو اس مقصد کے لیے انگریزوں نے بچہ سقہ کو میدان میں اتارا اور اس کی مدد کی۔ اس طرح اس نے کابل پر قبضہ کر لیا اور اپنی حکومت قائم کی جو چند مہینے ہی چل سکی۔ اس کی حکومت میں طوائف الملوکی کا دور دورہ تھا، لوٹ مار کا بازار گرم رہا، مگر بہت جلد جنرل نادر خان نے اس حالت سے عوام کو نجات دلائی اور ۱۹۲۹ء میں کابل کا تخت حاصل کر لیا۔ ۱۹۲۹ء تا ۱۹۳۳ء نادر شاہ افغانستان کے حکمران رہے۔

کتابیات

الكامل في التاريخ (لابن الأثير)

افغانستان د تاریخ په رڼا کی (استاد احمد علی کهزاد)

افغانستان د معاصر تاریخ په رڼا کی (شهسوار سنگر وال)
له احمد شاه بابا سره تر حامد کرزی
د افغانستان تاریخ له اصحابانو ترطالبانو(حانواک مفتی زاده)
د افغانستان پر معاصر تاریخ یوه لنډه کتنه (ڈاکٹر ابراہیم عطائی)
سیرِ افغانستان (مولانا سید سلیمان ندوی)
تاریخِ افغانستان (مولانا اسماعیل ریحان)

جاری ہے

*****